انسانی فرائض

از افادات

جناب سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر

مدظلہ العالی

مطبوعہ سرفراز قومی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین ابی القاسم محمد خاتم النبیین وآلہ الطیبین الطاہرین المعصومین من یومنا ھٰذا الی یوم الدین ۔

تمہید بیان

لاتفسدوا فی الارض، یہ میرا مختصر سا بیان ہے جو آپ کی نگاہوں کے سامنے آچکا ہے اُس اشتہار میں جو بطور دعوت نامہ شائع کیا گیا تھا ۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ میرا موضوع کلام ان دس دنوں میں فساد فی الارض اس کے انواع و اقسام، اُن کے علل و اسباب اور اس سلسلہ میں مذہب اسلام کی تعلیمات پر مشتمل ہے ۔

غیر خوش آیند موضوع، ناخوشگوار الفاظ اور ناگوار مفہوم کا حامل اس حد تک کہ اگرچہ دنیا اُس راستے کی سالک ہے جسے الفاظ ذہن میں لا رہے ہیں لیکن کوئی انسان اپنی طرف اس مفہوم کی نسبت دینے کو گوارا نہیں کر سکتا ۔

گویا مقام الفاظ میں فساد فی الارض کا وجود ہی نہیں ہے حالانکہ مقام عمل میں دنیا اُس سے لبریز ہے ۔

امامیہ مشن لکھنؤ کی اکاونویں دینی خدمت

چار سال سے مدرسۃ الواعظین میں حضرت سید العلماء دام ظلہ کے جو معرکۃ الآرا مواعظ ہوتے ہیں جن میں ہر مذہب و ملت کے ہزارہا افراد والہانہ شغف کیساتھ شریک ہوتے ہیں انھیں برابر امامیہ مشن کی جانب سے شارٹ ہینڈ کے ذریعے قلمبند کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔

صرف گذشتہ سال کے بیانات بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر شائع نہیں ہو سکے جس کا ہمیں انتہائی افسوس ہے۔

اس سال کے بیانات جو لغایت صفر ۱۳۵۶ھ دس روز تک مسلسل مدرسۃ الواعظین میں ہوئے تھے جس موضوع سے متعلق ہیں اس کا تقاضا تھا کہ انھیں جلد از جلد قوم کے سامنے پیش کر دیا جائے چنانچہ ہمیں خوشی ہے کہ ہم اس مقصد میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ہر سال شارٹ ہینڈ سے قلمبند کرنے کی خدمت میں خود انجام دیتا تھا لیکن اس سال مجھے انتہائی مسرت ہے کہ اس خدمت کو بحسن و خوبی میرے عزیز ہونہار شاگرد محمد طاہر صاحب رضا نے انجام دیا ہے جسے میں اپنی ریاضت کا ثمرہ سمجھتا ہوں۔ خدا دوسرے نوجوانان قوم کو اس طرح کے خدمات انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ والسلام

خادم مذہب

سید محمد رضا نقوی سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

اس بدترین صفت کے حال میں جس کی نسبت کو ہم اپنی طرف ہرگز گوارا نہیں کر سکتے اس طرح ایک دھچکا ہے جو طبیعت انسانی کو بار بار پہونچے گا اور ایک ٹھیس ہے جو خاطر اصحاب کے نازک آبگینوں کو برابر لگے گی۔

بہرحال میرا موضوع یہی ہے اور مجھے اس کے متعلق بیان کرنا ہے اور چونکہ اسمیں کوئی شخصی بحث نہیں ہے بلکہ کلیات ہیں اور ایسے کلیے جو تمام دنیا کو شامل ہیں اور کرۂ ارض کے کسی قطعہ سے مخصوص نہیں ہیں کیونکہ تمام عالم کے اجزاء اپنے ضروریات کے اعتبار سے، اپنے مختلف حالات کے اعتبار سے اور ان اسباب کے لحاظ سے جو ان کی ترقی کے لئے ضروری ہیں یا اُن کی تنزلی کا باعث ہیں ایک حد تک اشتراک رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی خاص قطعۂ ارض میں کم اور کہیں زیادہ لیکن بہرحال بحیثیت مجموعی اجزائے عالم اپنے میں فساد رکھتے ہیں۔ اب اس کا کسی کو برا نہ ماننا چاہیئے۔

اس وقت تمام عالم ان مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ کوئی خاص جماعت، کوئی خاص طبقہ، کوئی خاص محل اس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ عالم کا ہر شخص اس بات کا طالب ہے کہ کسی طرح یہ مصیبتیں دفع ہوں کسی طرح امن و سکون، راحت و اطمینان کی زندگی نصیب ہو۔

اس وقت میں اگر کوئی شخص یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ امراض کیا ہیں اور ان کے دفعیہ کی کیا صورت ہے کیا تدابیر ہیں جن سے امن و اطمینان حاصل ہو اور وہ زندگی کا دور جو بے چینی کی حالت میں گذر رہا ہے وہ راحت و سکون کی صورت

کوئی انسان ایسا نہ ہو گا جو اقرار کرے کہ ہیں فساد فی الارض کا طالب ہوں
گویا الفاظ ایسے ہیں کہ ناگواری انکی فطرت میں داخل ہے اور طبع انسانی پر گراں گزرنا
اُن کا لازمی خاصہ ہے۔

اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اصل فطرت کے لحاظ سے صلح پسند واقع ہوا ہے
یہ اسباب خارجی اور دوسرے حالات ہوتے ہیں جو فطرت صحیح پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور
انسان کے ذاتی جوہر شرافت کو مدغم کر کے اُس کو فساد کے راستے پر گامزن کرتے ہیں۔
اسی لئے باوجود اسکے کہ وہ اس راستے کے سالک ہیں لیکن پھر بھی انہیں اُس کے
نام سے محبت نہیں پیدا ہوتی حالانکہ دنیا میں جو کسی مسلک کا راہرو ہو وہ اُس مسلک
کی حمایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ٹھیک ہی ہے۔ اسی وجہ سے اختلاف آرا پیدا
ہوتا ہے جس چیز کو آپ بد سے بدتر سمجھتے ہیں دوسرا اُس کو بہتر سے بہتر سمجھتا ہے
آپ سرمایۂ ننگ قرار دیتے ہیں وہ اُس کو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے۔

لیکن فساد فی الارض، یہ چیز ہی ایسی کہ لاکھ انسان اس راستے پر
گامزن ہو لیکن وہ خود اُس سے نفرت ہی کرتا ہے۔

پھر ایسی چیز کے متعلق حاضرین کے سامنے روزانہ تفصیل ہوتی رہے، اس سے
ضرور طبیعت کو گریز ہونا چاہیئے خصوصاً جبکہ اسے عنوان کلام قرار دینا بتلا رہا ہے کہ
دنیا کو اس سبق کے یاد دلانے کی ضرورت ہے۔

اس کا نتیجہ ہونا چاہیئے کہ طبیعت انسانی پر بار پڑے اور یہ احساس ہو کہ کیا ہم

اور پھر ظاہری طور پر مختلف اعضا و جوارح سے مرکب ہے۔ جب تک اجزا مجتمع ہیں اس
مجموعہ کا وجود ہے اور اگر یہ اجزا مجتمع نہ رہیں تو یہ مجموعہ بھی فنا ہو جائے۔ اسی طرح
عالم انسانیت کا مجموعہ بھی افراد، قوام کے اجتماع پر مبنی ہے اور اگر یہ شیرازۂ اجتماع
برہم ہو جائے تو عالم انسانیت کا وجود رخصت ہو جائے۔

لیکن یاد رہے کہ مرکبات کے وجود کے لئے صرف اجزا کا کسی نہ کسی صورت پر
باہم اور یکجا ہو جانا کافی نہیں ہے بلکہ یہ ضروری ہے کہ ان کا اجتماع تناسب کے ساتھ ہو
یعنی ہر جزو دوسرے جزو کے لحاظ سے، اس کی مراعات کیا تھا، اس کا خیال کئے ہوئے
داخل ہوا ہو۔ اور اگر اجزا یکجا ہو گئے ہیں مگر آپس میں مناسبتوں کا لحاظ نہیں،
باہمی مراعات نہیں تو وہ تمام اجزا یکجا ضرور ہیں مگر ان سے ایک شیئی واحد جسے
مرکب کہہ سکیں طیار نہ ہو سکے گی۔

جیسے اینٹوں کا ڈھیر جسے ایک مزدور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل
کرتا ہے اور لیجا کر ڈال دیتا ہے اُسے کوئی خیال نہیں ہوتا کہ ان اینٹوں میں کوئی
ترتیب ہو۔ کوئی تناسب ہو اُسے تو انھیں ڈھیر کی صورت میں لگا دینے سے مطلب ہے
یہ اینٹیں باہم دیگر پاس پاس ضرور ہیں مگر چونکہ ان کا اجتماع کسی تناسب پر مبنی
نہیں ہے اس لئے ان کے اجتماع سے کوئی وحدانی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر انہی اینٹوں کو آپ کسی معمار کو دیجئے۔ وہ بھی ان اینٹوں کو مجتمع
صورت سے پہلو بہ پہلو رکھے ہی گا مگر اس میں ترتیب ملحوظ ہو گی۔ ایک اینٹ دوسری

میں تبدیل ہو تو یقیناً یہ تمام باتیں سننے کے قابل ہیں۔

یاد رکھنا چاہیے کہ تلخ دوا نتیجۃً خوشگوار ہوتی ہے اس لئے کہ مرض ایسی ناگوار چیز اسی کے ذریعہ سے رفع ہوتی ہے۔

میرے بیانات اگر کسی کے لئے تلخ، بدمزہ، غیر دلچسپ اور غیر دلآویز ثابت ہوں اور یقیناً ہونگے اس لئے کہ اس ادبی ہند لچسپی کا وجود نہیں ہے۔ یہ خارزار ہے جس میں خوشگوار مناظر تفریح نصیب نہیں ہو سکتے۔ تو اس سے بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے بیان کیلئے ہمیشہ میں مجمع کو یہ کہکر سننے کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ دلچسپی کی توقع نہ رکھے۔ میں آپکو دھوکا نہیں دینا چاہتا کہ الفاظ کا سبز باغ دکھلا کر یہ توقع قائم کروں کہ میرا بیان دلچسپ ہوگا بلکہ میں یہ سمجھکر ہمیشہ بیان کرتا ہوں کہ مجھے ایک غیر دلچسپ چیز بیان کرنا ہے اور سننے والوں کو یہ سمجھکر سننے کی دعوت دیتا ہوں کہ حقیقۃً وہ ایک غیر دلچسپ چیز سنینگے۔ جہانتک سننے کے مفاد کا تعلق ہے اگر کوئی جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سنے اور سمجھے تو میری محنت ٹھکانے لگے گی اگر کوئی نہ بھی سنے تو کہنا میرا فرض ہے ؎ کس بشنو یا نشنو دمن گفتگوئے میکنیم۔

فساد فی الارض کا انفرادی و ترکیبی مفہوم

لا تفسدوا فی الارض) اس میں سب سے پہلے ضرورت اس امر کے بیان کرنے کی ہے کہ فساد کیا چیز ہے۔ پھر یہ کہ جب اس فساد کی نسبت روئے زمین کی طرف دیجائے تو اس کے مفہوم میں کیا تبدیلی پیدا ہوتی ہے؟

اس کے لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح ہیکل انسانی مختلف عناصر، مختلف خلاط

لیکن وہ مفرد دوائیں بجائے خود مدت کی رکھی ہوئی ہوں اور زمانہ دراز کی رطوبت و برودت کے اثر کو برداشت کئے ہوئے اپنے خصوصیاتِ ذاتی کھوئے ہوئے اپنے آثار و خواص کو خیرباد کہے ہوئے ۔ ان اجزا کو ملا کر آپنے ترکیب دیا مگر چونکہ مفردات ناقص تھے اس لئے اُن کا مجموعہ جو ہوگا وہ بھی ناقص ہوگا یہاں فساد جو پیدا ہوا ہے وہ مفردات کی خرابی سے ۔ اس خرابی کے درجے مختلف ہوتے رہتے ہیں ۔ فرض کیجئے جتنی دوائیں تھیں سب ہی ناقص تھیں تو اُن کا مجموعہ بالکل ہی ناقص ہوگا اور ممکن ہے کہ بعض دوائیں کامل ہوں اور بعض ناقص تو اُن کا مجموعہ ایک متوسط درجہ پر ہوگا جو کسی حد تک ناقص ضرور ہے مگر اُتنا نہیں جتنا پہلی قسم کا ناقص مرکب ۔

اب اگر فرض کیا جائے کہ سب جزو کامل اور ایک جزو ناقص تو ممکن ہے یہ مجموعہ اپنے مفاد و مقصد کو پورا کرنے مگر بہرحال کسی درجہ تک اُس میں نقص ضرور موجود ہوگا یعنی اُس مجموعہ کی بہ نسبت جس میں وہ ایک جزو بھی ناقص نہ ہوتا بلکہ سب جزو کامل ہی ہوتے ۔

معلوم ہوا کہ اس طرح کا نقص مجموعہ میں مفردات کی بنا پر پیدا ہونا ضروری ہے ۔ اس کے برخلاف یہ صورت ہے کہ مفردات بجائے خود اپنے حدود میں ٹھیک ہیں اور ہر ایک اپنے خواص و آثار کا حامل ہے مگر ترکیب میں خرابی ہوئی ہے خرابی کی بھی دو صورتیں ہیں ایک مقدار کے لحاظ سے یعنی ہر عنصر کو جتنا ہونا

اینٹ کے لحاظ سے رکھی جائیگی۔ اگر کوئی بڑی اینٹ ہو اور اسکے دوسری اینٹ کے پاس رکھدینے سے وہ استقامت، وہ درستی کہ جو ہونا چاہیئے موجود نہ رہے گی تو وہ معمار اس اینٹ کو وہاں سے ہٹا دیگا۔ وہ اینٹ رکھدیگا جو اس جگہ کے مناسب ہو۔ یہ ردّوبدل کس لئے ہے صرف تناسب کے لحاظ سے۔ جب اس خصوصیت کو ملحوظ رکھکر وہ اینٹیں یکجا ہوگئیں تو ان کے اجتماع سے ایک واحد مرکب عالم وجود میں آگیا جس کا نام ہے دیوار۔

معلوم ہوا کہ کسی ہیئت وحدانی کے حاصل ہونے کے لئے صرف کثرت کے اجزا کا مجتمع ہو جانا کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے اس بات کی کہ اس کثرت کے اجزا آپس میں ایک دوسرے کے لحاظ کے ساتھ بہم ہوئے ہوں۔ جس وقت تک یہ مناسبتیں قائم رہیں گی اُس وقت تک وہ نظام مجموعی صلاحیت کے حدود میں رہیگا۔ اور جس وقت میں یہ مناسبتیں مفقود ہوگئیں تو اس وقت میں وہ نظام خراب ہو جائیگا۔ اس کا نام ہے فساد۔

اب ہو سکتا ہے کہ وہ اجزا جن سے اس مجموعہ کی ترکیب ہوئی ہے اُن میں سے ہر ایک خود بھی بجائے خود خراب ہو مثلاً ایک دوا معجون کی صورت میں مختلف اجزا سے مرکب ہے۔ وہ تمام اجزا پوری احتیاط کے ساتھ ترتیب دئے جائیں۔ اُن کا وزن مناسب رکھا جائے اور ہر دوا اتنی ہی مقدار میں جتنی ہونی چاہیئے اتنی ہی داخل کی جائے اور جس صورت پر ان اجزا کو مخلوط کرنا چاہیئے اسی طرح مخلوط کئے جائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید الانبیاء والمرسلین ابی لقاسم محمد خاتم النبیین وآلہ الطیبین الطاہرین المعصومین من یومنا ھذا الی یوم الدین ۔

تمہید بیان

لاتفسدوا فی الارض ، یہ میرا سرنامہ بیان ہے جو آپ کی نگاہوں کے سامنے آچکا ہے اُس اشتہار میں جو بطور دعوت نامہ شائع کیا گیا تھا ۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ میرا موضوع کلام ان دس دنوں میں فساد فی الارض کی اس کے انواع و اقسام، اُن کے علل و اسباب اور اس سلسلہ میں مذہب اسلام کی تعلیمات پر مشتمل ہے ۔

غیر خوش آیند موضوع ، ناخوشگوار الفاظ اور ناگوار مفہوم کا حامل اس حد تک کہ اگرچہ دنیا اُس راستے کی سالک ہے جسے الفاظ ذہن میں لا رہے ہیں لیکن کوئی انسان اپنی طرف اس مفہوم کی نسبت دینے کو گوارا نہیں کر سکتا ۔

گویا مقام الفاظ میں فساد فی الارض کا وجود ہی نہیں ہے حالانکہ مقام عمل میں دنیا اُس سے لبریز ہے ۔

امامیہ مشن لکھنؤ کی اٹھاونویں دینی خدمت

چار سال سے مدرسۃ الواعظین میں حضرت سید العلما دام ظلہ کے جو معرکۃ آلآرا مواعظ ہوتے ہیں جن میں ہر مذہب و ملت کے ہزار ہا افراد والہانہ شغف کیساتھ شریک ہوتے ہیں انھیں برابر امامیہ مشن کی جانب سے شارٹ ہینڈ کے ذریعہ سے قلمبند کر کے شایع کیا جارہا ہے۔

صرف گزشتہ سال کے بیانات بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر شایع نہیں ہو سکے جسکا ہمیں انتہائی افسوس ہے۔

اس سال کے بیانات جو لغایت صفر ۱۳۵۶ھ دس روز تک مسلسل مدرسۃ الواعظین میں ہوئے تھے جس موضوع سے متعلق ہیں اس کا تقاضا تھا کہ انھیں جلد از جلد قوم کے سامنے پیش کر دیا جائے چنانچہ ہمیں خوشی ہے کہ ہم اس مقصد میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ ہر سال شارٹ ہینڈ سے قلمبند کرنے کی خدمت میں خود انجام دیتا تھا لیکن اس سال مجھے انتہائی مسرت ہے کہ اس خدمت کو بحسن و خوبی میرے عزیز ہونہار شاگرد محمد طاہر رضا نے انجام دیا ہے جسے میں اپنی ریاضت کا ثمرہ سمجھتا ہوں۔ خدا دوسرے نوجوانان قوم کو اس طرح کے خدمات انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ والسّلام

خادم مذہب

سید محمد رضا نقوی سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

اس بدترین صفت کے حامل ہیں جس کی نسبت کو ہم اپنی طرف ہرگز گوارا نہیں کرسکتے اس طرح ایک دھچکا ہے جو طبیعت انسانی کو بار بار پہونچے گا اور ایک ٹھیس ہے جو خاطر اصحاب کے نازک آبگینوں کو برابر لگے گی۔

بہرحال میرا موضوع یہی ہے اور مجھے اس کے متعلق بیان کرنا ہے اور چونکہ اسمیں کوئی شخصی بحث نہیں ہے بلکہ کلیات ہیں اور ایسے کلیے جو تمام دنیا کو شامل ہیں اور کرۂ ارض کے کسی قطعہ سے مخصوص نہیں ہیں کیونکہ تمام عالم کے اجزاء اپنے ضروریات کے اعتبار سے، اپنے مختلف حالات کے اعتبار سے اور ان اسباب کے لحاظ سے جو ان کی ترقی کے لئے ضروری ہیں یا ان کی تنزلی کا باعث ہیں ایک حد تک اشتراک رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی خاص قطعۂ ارض میں کم اور کہیں زیادہ لیکن بہرحال بحیثیت مجموعی اجزائے عالم اپنے میں فساد رکھتے ہیں۔ اب اس کا کسی کو برا نہ ماننا چاہیئے۔

اس وقت تمام عالم ان مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ کوئی خاص جماعت، کوئی خاص طبقہ، کوئی خاص محل اس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ عالم کا ہر شخص اس بات کا طالب ہے کہ کسی طرح یہ مصیبتیں دفع ہوں کسی طرح امن وسکون، راحت واطمینان کی زندگی نصیب ہو۔

اس وقت میں اگر کوئی شخص یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ امراض کیا ہیں اور ان کے دفعیہ کی کیا صورت ہے کیا تدابیر ہیں جن سے امن واطمینان حاصل ہو اور وہ زندگی کا دور جو بے چینی کی حالت میں گذر رہا ہے وہ راحت وسکون کی صورت

کوئی انسان ایسا نہو گا جو اقرار کرے کہ میں فساد فی الارض کا مرتکب ہوں گویا الفاظ ایسے ہیں کہ ناگواری انکی فطرت میں داخل ہے اور طبع انسانی پر گراں گذرنا اُن کا لازمی خاصہ ہے۔

اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اصل فطرت کے لحاظ سے صلح پسند واقع ہوا ہے یہ اسباب خارجی اور دوسرے حالات ہوتے ہیں جو فطرت صحیح پر پردہ ڈالدیتے ہیں اور انسان کے ذاتی جوہر شرافت کو مدھم کر کے اُس کو فساد کے راستے پر گامزن کرتے ہیں۔

اسی لئے باوجود اسکے کہ وہ اس راستے کے سالک ہیں لیکن پھر بھی اُنہیں اُس کے نام سے محبت نہیں پیدا ہوتی حالانکہ دنیا میں جو کسی مسلک کا راہرو ہو وہ اُس مسلک کی حمایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ٹھیک ہی ہے۔ اسی وجہ سے اختلاف آرا پیدا ہوتا ہے جس چیز کو آپ بد سے بدتر سمجھتے ہیں دوسرا اُس کو بہتر سے بہتر سمجھتا ہے آپ سرمایۂ ننگ قرار دیتے ہیں وہ اُس کو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے۔

لیکن فساد فی الارض، یہ چیز ہی ایسی کہ لاکھ انسان اس راستے پہ گامزن ہو لیکن وہ خود اُس سے نفرت ہی کرتا ہے۔

پھر ایسی چیز کے متعلق حاضرین کے سامنے روزانہ تفصیل ہوتی رہے، اس سے ضرور طبیعت کو گریز ہونا چاہیئے خصوصاً جبکہ اسے عنوان کلام قرار دیا بتلا رہا ہے کہ دنیا کو اس سبق کے یاد دلانے کی ضرورت ہے۔

اس کا نتیجہ ہونا چاہیئے کہ طبیعت انسانی پہ بار پڑے اور یہ احساس ہو کہ کیا ہم

اور پھر ظاہری طور پر مختلف اعضا و جوارح سے مرکب ہے۔ جبتک اجزا مجتمع ہیں اس مجموعہ کا وجود ہے اور اگر یہ اجزا مجتمع نہ رہیں تو یہ مجموعہ بھی فنا ہو جائے۔ اسی طرح عالم انسانیت کا مجموعہ بھی افراد، قوام کے اجتماع پر مبنی ہے اور اگر یہ شیرازہ اجتماع برہم ہو جائے تو عالم انسانیت کا وجود رخصت ہو جائے۔

لیکن یاد رہے کہ مرکبات کے وجود کے لئے صرف اجزا کا کسی نہ کسی صورت پر باہم اور یکجا ہو جانا کافی نہیں ہے بلکہ یہ ضروری ہے کہ ان کا اجتماع تناسب کے ساتھ ہو یعنی ہر جزو دوسرے جزو کے لحاظ سے اس کی مراعات کیا تھا، اس کا خیال کرتے ہوئے داخل ہوا ہو۔ اور اگر اجزا یکجا ہو گئے ہیں مگر آپس میں مناسبتوں کا لحاظ نہیں، باہمی مراعات نہیں تو وہ تمام اجزا یکجا ضرور ہیں مگر ان سے ایک شئی واحد جسے مرکب کہہ سکیں طیار نہ ہو سکے گی۔

جیسے اینٹوں کا ڈھیر جب ایک مزدور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا ہے اور لیجا کر ڈال دیتا ہے اُسے کوئی خیال نہیں ہوتا کہ ان اینٹوں میں کوئی ترتیب ہو۔ کوئی تناسب ہو اُسے تو انھیں ڈھیر کی صورت میں لگا دینے سے مطلب ہے اینٹیں باہم دیگر پاس پاس ضرور ہیں مگر چونکہ اُن کا اجتماع کسی تناسب پر مبنی نہیں ہے اس لئے ان کے اجتماع سے کوئی وحدانی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر انہی اینٹوں کو آپ کسی معمار کو دیجئے۔ وہ بھی ان اینٹوں کو مجتمع صورت سے پہلو بہ پہلو رکھے ہی گا مگر اس میں ترتیب ملحوظ ہو گی۔ ایک اینٹ دوسری

میں تبدیلی ہو تو یقیناً یہ تمام باتیں سننے کے قابل ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ تلخ دوا نتیجۃً خوشگوار ہوتی ہے اس لئے کہ مرض ایسی ناگوار چیز اسی کے ذریعہ سے دفع ہوتی ہے۔

میرے بیانات اگر کسی کے لئے تلخ، بدمزہ، غیر دلچسپ اور غیر دلآویز ثابت ہوں اور یقیناً ہونگے اس لئے کہ اس ادبی پہلو دلچسپی کا وجود نہیں ہے۔ یہ خارزار ہے جس میں خوشگوار مناظر تفریح نصیب نہیں ہو سکتے۔ تو اس سے بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے بیان کیلئے ہمیشہ میں مجمع کو یہ کہکر سننے کی دعوت دیتا ہوں کہ وہ دلچسپی کی توقع نہ رکھے۔ میں آپکو دھوکا نہیں دینا چاہتا کہ الفاظ کا سبز باغ دکھلاکر یہ توقع قائم کروں کہ میرا بیان دلچسپ ہوگا بلکہ میں یہ سمجھکر ہمیشہ بیان کرتا ہوں کہ مجھے ایک غیر دلچسپ چیز بیان کرنا ہے اور سننے والوں کو یہ سمجھکر سننے کی دعوت دیتا ہوں کہ حقیقۃً وہ ایک غیر دلچسپ چیز سنینگے۔ جہاں تک سننے کے مفاد کا تعلق ہے اگر کوئی جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سنے اور سمجھے تو میری محنت ٹھکانے لگے گی اگر کوئی نہیں سنے تو کہنا میرا فرض ہے۔ ؎ کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم۔

فساد فی الارض کا انفرادی و ترکیبی مفہوم

(لا تفسدوا فی الارض) اس میں سب سے پہلے ضرورت اس امر کے بیان کرنے کی ہے کہ فساد کیا چیز ہے۔ پھر یہ کہ جب اس فساد کی نسبت روئے زمین کی طرف دیجائے تو اس کے مفہوم میں کیا تبدیلی پیدا ہوتی ہے؟

اس کے لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح ہیکل انسانی مختلف عناصر، مختلف اخلاط

لیکن وہ مفرد دوائیں بجائے خود مدت کی رکھی ہوئی ہوں اور زمانہ دراز کی رطوبت و برودت کے اثر کو برداشت کئے ہوئے اپنے خصوصیات ذاتی کھوئے ہوئے اپنے آثار و خواص کو خیرباد کہے ہوئے ــــ ان اجزاء کو ملاکر آپنے ترکیب دیا مگر چونکہ مفردات ناقص تھے اس لئے اُن کا مجموعہ جو ہوگا وہ بھی ناقص ہوگا یہاں فساد جو پیدا ہوا ہے وہ مفردات کی خرابی سے۔ اس خرابی کے درجے مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ فرض کیجئے جتنی دوائیں تھیں سب ہی ناقص تھیں تو اُن کا مجموعہ بالکل ہی ناقص ہوگا اور ممکن ہے کہ بعض دوائیں کامل ہوں اور بعض ناقص تو اُن کا مجموعہ ایک متوسط درجہ پر ہوگا جو کسی حد تک ناقص ضرور ہے مگر اتنا نہیں جتنا پہلی قسم کا ناقص مرکب۔

اب اگر فرض کیا جائے کہ سب جزد کامل اور ایک جزد ناقص تو ممکن ہے یہ مجموعہ اپنے مفاد و مقصد کو پورا کردے مگر بہر حال کسی درجہ تک اُس میں نقص ضرور موجود ہوگا یعنی اُس مجموعہ کی بہ نسبت جس میں وہ ایک جزو بھی ناقص نہ ہوتا بلکہ سب جزد کامل ہی ہوتے۔

معلوم ہوا کہ اس طرح کا نقص مجموعہ میں مفردات کی بنا پر پیدا ہونا ضروری ہے اس کے برخلاف یہ صورت ہے کہ مفردات بجائے خود اپنے حدود میں ٹھیک ہیں اور ہر ایک اپنے خواص و آثار کا حامل ہے مگر ترکیب میں خرابی ہوئی ہے خرابی کی بھی دو صورتیں ہیں ایک مقدار کے لحاظ سے یعنی ہر عنصر کو جتنا ہونا

اینٹ کے لحاظ سے رکھی جائیگی۔ اگر کوئی بڑی اینٹ ہو اور اُسکے دوسری اینٹ کے پاس رکھدینے سے وہ استقامت، وہ درستی کہ جو ہونا چاہیئے موجود نہ رہے گی تو وہ معمار اُس اینٹ کو وہاں سے ہٹا دیگا۔ وہ اینٹ رکھدیگا جو اس جگہ کے مناسب ہو۔ یہ ردّوبدل کس لئے ہے صرف تناسب کے لحاظ سے۔ جب اس خصوصیت کو ملحوظ رکھکر وہ اینٹیں یکجا ہوگئیں تو اُن کے اجتماع سے ایک واحد مرکب عالم وجود میں آگیا جس کا نام ہے دیوار۔

معلوم ہوا کہ کسی ہیئت وحدانی کے حاصل ہونے کے لئے صرف کثرت کے اجزاء کا مجتمع ہوجانا کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت ہے اس بات کی کہ اس کثرت کے اجزاء آپس میں ایک دوسرے کے لحاظ کیساتھ باہم جڑے ہوں جس وقت تک یہ مناسبتیں قائم رہیں گی اُس وقت تک وہ نظام نوعی صلاحیت کے حدود میں رہیگا۔ اور جس وقت میں یہ مناسبتیں مفقود ہوگئیں تو اس وقت میں وہ نظام خراب ہوجائیگا۔ اس کا نام ہے فساد۔

اب ہو سکتا ہے کہ وہ اجزاء جن سے اس مجموعہ کی ترکیب ہوئی ہے اُن میں سے ہر ایک خود بھی بجائے خود خراب ہو مثلاً ایک دوا معجون کی صورت میں مختلف اجزا سے مرکب ہے۔ وہ تمام اجزا اگر پوری احتیاط کیساتھ ترتیب دئے جائیں۔ اُن کا وزن مناسب رکھا جائے اور ہر دوا اتنی ہی مقدار میں جتنی ہونی چاہیئے اتنی ہی داخل کی جائے اور جس صورت پر ان اجزاء کو مخلوط کرنا چاہیئے اسی طرح مخلوط کئے جائیں

وہ مجموعہ بھی ناقص اور اپنی صلاحیتوں کے حدود میں غیر مکمل ہوگا۔

بے شک فساد کے درجے مختلف ہیں۔ اگر ہر فرد ناقص ہے تو مجموعہ سرتاپا نقصان ہوگا اور اگر بعض افراد ناقص ہیں اور بعض کامل تو اس اعتبار سے مجموعہ میں نقص کمال کے بین بین حالت کا مظاہرہ ہوگا۔ جبکہ انسان کے ہر طرح کے نقائص و فسادات عالم انسانی کے فساد کا موجب ہیں تو علمائے علم اخلاق نے جو فرائض انسانی کی تقسیم کی ہے اور کہا ہے کہ اس کے تین شعبے ہیں ایک وہ جو انسان کی ہی انفرادی حیثیت سے متعلق ہے اور اس کا نام ہے تہذیب اخلاق۔ دوسرے وہ تعلقات جو ایک گھر کے رہنے والوں کے ساتھ قائم ہو سکتے ہیں اس کا نام ہے تدبیر منزل اور پھر وہ تعلقات جو دنیا والوں کے ساتھ ہیں اس کا نام ہے سیاست مدن۔

یہ تمام شعبے اور ان کے اعتبار سے ہونے والے فسادات سب فساد فی الارض میں داخل ہوں گے۔ اب "فساد فی الارض" ایک وسیع مفہوم ہوگا جس کے اندر ہر انسان کی بداخلاقی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی داخل ہوگی اور اس طرح تمام علم اخلاق اور علم شریعت اسی عنوان کے تحت میں مندرج ہوگا۔

ہر انسان کی کوئی معمولی سی کمزوری کہ جو شریعت و اصول اخلاق کے خلاف ہے وہ "فساد فی الارض" کے حدود میں داخل ہو جائیگی۔

موضوع کو آسان سے آسان تر اور انتہائی وسیع بنانے کے لئے حیثیت مقرر کے میرے لئے مناسب یہی تھا کہ میں "فساد فی الارض کے اسی وسیع مفہوم پر

چاہیئے تھا اُس کی بہ نسبت زیادہ ہو گیا یا کم۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجموعہ اپنے اثر اجتماعی کے اعتبار سے ناقص ہو کیونکہ اُس میں وہ مزاج موجود نہیں ہے جو اس مرکب میں ہونا چاہیئے تھا دوسرے کیفیت کے لحاظ سے یعنی صورت ترکیب میں خرابی ہو جائے مثلاً جس جزو کو مقدم ہونا چاہیئے تھا وہ موخر ہو جائے اور جو موخر ہونا چاہیئے تھا وہ مقدم۔ اس سے بھی اس مجموعہ میں فساد پیدا ہو جائیگا اور وہ اپنے مفاد ترکیبی کو پورا نہ کر سکے گا۔

جس طرح دنیا کے ہر نظام ترکیبی میں یہ صورت ہے اسی طرح نظام نوع انسانی عالم بشریت کا مجموعہ بھی مختلف عناصر سے مرکب ہے۔ مختلف اجزا اسے مل کر کمال کو پہونچاتے ہیں۔ مختلف اس کے مفردات ہیں جن کے اجتماع سے یہ تیار ہوتی ہے اگر آپ اس لحاظ سے دیکھئے جو میں نے دنیا کے ہر مرکب میں آپ کے سامنے پیش کی ہے اور صلاح و فساد کی اُن صورتوں پر نظر ڈالیے جو میں نے بیان کی ہیں تو نتیجہ یہ نکلیگا کہ انسانی افراد میں سے ہر ہر شخص کی انفرادی خرابی اثر انداز ہوگی اس عالم کائنات کے مجموعہ پر یعنی ہر ہر انسان کی جو ذاتی خرابیاں ہیں، جو اخلاقی نقائص ہیں وہ تمام ایک طرح کے فساد کا باعث ہوں گے اُس مجموعہ میں جس کی انہی اشخاص سے تشکیل ہو رہی ہے۔

جب افراد بجائے خود ناقص ہیں اور اُن خصائص کے حامل ہیں جو انہیں بحیثیت کمال انسانی نہ ہونا چاہیئیں یہ مجموعہ ان تمام افراد کے اجتماع سے حاصل ہوگا

ہیں، وہ فساد کرنے کے لئے دوسری دنیا تھوڑی تلاش کریگا۔

درحقیقت " فی الارض " کی قید یہاں پہ متعلق کے اعتبار سے ہے یعنی زمین خدا کو فساد پذیر نہ بناؤ۔ خود اُس کو خراب کرو۔ اس لئے اس کے ساتھ ایک تملہ بھی قرآن میں موجود ہے کہ لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا اس " بعد اصلاحھا " کے جزو کے بعد کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ یہاں صلاح اور فساد دونوں کا متعلق خود روئے زمین ہے یعنی روئے زمین کی اصلاح کے بجائے اُس کی تخریب کرو۔

اب دیکھنا ہے کہ " زمین کو خراب کرنے کا کیا مطلب ؟ کیا اس سے مراد خود بسیط ارض، یہ سطح خاک مراد ہے۔

" زمین کو خراب کرو " یعنی مثلاً کسی کاشتکار کی زمین کو جاکر اُس میں دانہ پیدا کرنے کی صلاحیت سلب کرو۔ اُس کے زندہ خطۂ زمین کو شورہ زار بنا کر مردہ نہ کردو۔ یہ صورت وہ ہے جو لفظی حیثیت سے بے شک زمین کے خراب کرنے کا صحیح مصداق ہے۔

لیکن کیا لا تفسدوا فی الارض کے یہی معنی ہیں ؟ ہرگز نہیں۔ پھر کیا ؟

درحقیقت " ارض " سے مراد یہاں یہ سطح زمین باعتبار اپنی جمادی خلقت کے نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہے " کرۂ ارض " باعتبار اپنے اُن رہنے والوں کے جو اُس میں رہتے سہتے اور بستے ہیں۔

یہ بات آپکے روزمرہ کے محاوروں میں بھی نوک زبان ہے۔ آپ کسی موقع پر کہتے ہیں کہ " تمام شہر اس کا گواہ ہے " کیا اس سے مقصود ہے در و دیوار اور سطح زمین آبلے فلک

زور دیا تاکہ میرے بیان میں کافی گنجائش پیدا ہو جائے۔ مگر حقیقتہً جہاں تک میں غور کرتا ہوں "فساد فی الارض" کا وہ مفہوم جس کے لحاظ سے قرآن میں اسکا استعمال کیا گیا ہے یہ نہیں ہے یعنی انسانوں کی ذاتی بداخلاقیاں، بری طرح کی پابندیاں شریعت سے کنارہ کشی کرنا اور واجبات کو ترک کرنا یہ سب لاتفسدوا فی الارض کے تحت میں داخل نہیں ہے۔

جب ایسا نہیں ہے تو ضرورت ہے کہ "فساد فی الارض" کے مفہوم کی تشریح کی جائے اور اسی لئے میں نے سابق میں یہ تنقیح قائم کی تھی کہ کیا "فساد" کی لفظ کا انفرادی حیثیت سے جو مفہوم ہے وہ "فساد فی الارض" کے ترکیبی الفاظ میں اسی صورت پر برقرار رہتا ہے یا اس میں کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے۔

لاتفسدوا فی الارض، "روئے زمین میں فساد برپا نہ کرو" اس کے معنی؟ "روئے زمین میں" یعنی زمین کو ظرف فساد نہ بناؤ؟

اس کا تو کوئی حاصل نہ ہوا اس لئے کہ جو بھی فساد ہوگا وہ بہر حال اس زمین کے حدود میں ہوگا۔ سمندر کی سطح پر، یا ہوائی جہاز پر فضائے ہوا میں کوئی فساد ہو تو وہ بھی حدود ارض ہی میں ہے اگر "فی الارض" میں ظرفیت باعتبار محل ہے اور جگہ کے اعتبار سے کہا جا رہا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو اس قید کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔ اسلئے کہ بہر حال جب انسان اس دنیا میں ہے تو وہ جو فساد کریگا اسی دنیا

یونہی "فساد فی الارض" زمین کے رہنے والے مخلوقات میں اگرچہ چرند بھی ہیں پرند بھی، نباتات بھی جمادات بھی مگر جس کا فسا و معیاری حیثیت رکھتا ہے اور اس تمام وسیع دنیائے زمین میں جالب توجہ ہے وہ اہل ارض کے اسی طبقہ کا فساد جو حس و شعور اور تعقل و اختیار کے جوہروں کا حامل ہے یعنی انسان۔

اب معلوم ہوگا کہ مفردات الفاظ کے معانی کی نسبت سے اس ترکیبی فقرے کے مفہوم میں کیا انقلاب ہو گیا۔ الفاظ کی دنیا عجیب و غریب ہے۔ اس میں معانی کے اعتبار سے نئے نئے انقلابات ہوتے رہتے ہیں۔ جو شخص الفاظ کے بالکل ظاہری اصلی و ابتدائی معانی پر الفاظ کو محمول کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کو افہام و تفہیم میں بڑے مشکلات سے دوچار ہونا لازمی ہے۔

اس کا نتیجہ وہی ہوگا کہ حکیم صاحب کے اس ارشاد کی بنا پر کہ "جاؤ اس نسخہ کو جوش دیکر پی لینا" وہ بیچارہ دیہاتی اس لکھے ہوئے پرچہ کاغذ ہی کو لیجا کر جوش دیکر پی لے۔ الفاظ کے اعتبار سے اس کا طرز عمل بالکل ٹھیک ہے، اس لئے کہ نسخہ نام اسی پرچہ کا ہے۔ دواؤں کا نہیں جو عطار کے یہاں سے آتی ہیں۔ انسان اس طرح اپنی دنیائے روزمرہ میں زندگی نہیں گذار سکتا۔

لا تفسدوا فی الارض، کے مفہوم میں الفاظ کے انفرادی و سطحی معانی کو دیکھتے ہوئے انقلاب ہوا۔ سب سے پہلے "زمین" سے مراد ہوئے "اہل زمین" یہ کسی عام مفہوم میں قیود کے ذریعے سے تحدید پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ مفہوم لفظ کو ایک بالکل

شہر تو اسی کا نام ہے۔ مثلاً اگر کوئی واقعہ ایسا ہو کہ لکھنؤ کے تمام رہنے والے لکھنؤ چھوڑ کر دہلی چلے جائیں تو بھی لکھنؤ اپنی جگہ ہی پر رہیگا۔ یہ نہیں کہا جائیگا کہ لکھنؤ دہلی پہونچ گیا بلکہ لکھنؤ خالی ہوگیا اور لکھنؤ کے لوگ دہلی چلے گئے معلوم ہوا کہ لکھنؤ نام رہنے والوں کا نہیں بلکہ اس رقبۂ زمین اور اسکے عمارات وغیرہ کا ہے لیکن جب آپ نے کہا کہ "تمام شہر اسبات کا گواہ ہے" وہاں شہر سے مراد یہ در و دیوار نہیں ہیں کیونکہ وہ گواہی دینے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح آپ فرماتے ہیں "تمام شہر اس سے واقف ہے" "تمام شہر سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے" وغیرہ وغیرہ یقیناً شہر سے مراد ان تمام مواقع پر تو یہیں اہل شہر "تمام دنیا اس کو جانتی ہے" "تمام ملک اس سے واقف ہے" "تمام صوبہ اس سے آگاہ ہے" یہ تمام وہ الفاظ ہیں جو برابر ہماری زبان پہ آیا کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اسکی نظیر ہے" واسأل القریۃ التی کنا فیھا والعیر التی اقبلنا فیھا وانا لصادقون" حضرت یوسف کے قصہ میں ہے کہ ان کے بھائیوں نے حضرت یعقوب سے کہا آپ اس قریہ سے پوچھ لیجئے جس میں ہم تھے" بالکل ظاہر ہے کہ "قریہ" سے مراد یہاں پر اہل قریہ ہیں۔ انہی مثالوں کے مطابق زمین کے صلاح و فساد سے مراد اہل زمین کا صلاح و فساد ہے پھر اہل سے مقصد وہ زمین کے اوپر کی مخلوق مراد نہیں جو ذی شعور نہ ہو۔ جیسے لکھنؤ اس میں نباتات تھے حیوانات تھے مگر جو مخلوق ان میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا وہ انسان اسلئے یہ کہنے کا محل ہوا کہ تمام لکھنؤ واقف ہے حالانکہ واقفیت کا تعلق صرف لکھنؤ کے رہنے والے ذی شعور طبقہ یعنی انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور اُن کے افرادی و ترکیبی معانی کا تعلق ہو کلام الٰہی کے مفہوم میں غور و خوض کرنیکا اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح دوسرے اہل زبان کے محاورات میں اور لفظی و عقلی قرائن کی بنا پر اُسی طرح معانی کا تعین کیا جا سکتا ہے جس طرح دوسرے الفاظ میں۔

اب "لا تفسدوا فی الارض" کے معنی ان تمام انقلابات کے بعد کیا ہوئے؟ یہ کہ مجموعۂ عالم بشری کے فساد کا باعث نہو۔

اب اگر مجموعۂ عالم بشری کا فساد اُس طرح ہی جو ہم نے سابق میں بیان کیا کہ ایک فرد میں بھی اگر خرابی پیدا ہوئی تو وہ خرابی مجموعہ کی طرف عائد ہوگی اور اس لئے ہر فرد جو کسی بُرے فعل کا ارتکاب کرے وہ "فساد فی الارض" کا مرتکب ہے اگرچہ اس بُرائی کا کوئی تعلق اُس کی ذات کے سوا کسی دوسرے شخص سے نہو۔

اگر ایسا ہو تو اس فساد و صلاح میں اس "فی الارض" کی قید کا کوئی منشا ہی نہیں "مجموع عالم انسانیت" کو محل فساد قرار دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں اب تو نتیجہ یہ ہے کہ تم خود فاسد نہو کسی طرح کا فساد پیدا نہ کرو۔

کیونکہ جب کسی صورت سے بھی خود فاسد ہوئے یا فساد پیدا کیا تو بہر حال یہ فساد "مجموع عالم" کی طرف راجع ہوا۔ پھر "مجموع عالم" کی قید لگانے اور "فی الارض" کے اضافہ کرنے کا نتیجہ؟

اب کونسا فساد ایسا ہے جو "فساد" تو ہو مگر "فساد فی الارض" کا مصداق نہو۔ کیونکہ بہر حال ہم اس مجموعہ کی فرد ہیں۔ اور بہر حال جو خرابی ہم میں پیدا ہو وہ

مبائن جداگانہ مفہوم پر محمول کرنا ہو پھر "اہل زمین" میں تحدید ہوئی کہ سب نہیں
بلکہ مخصوص ذی شعور مخلوق یعنی انسان۔ اس طرح تمام زمین کے رہنے والے اشیاء جمادات
نباتات حیوانات خارج ہوے اور دائرہ ایک قسم سے مخصوص ہو گیا۔

یہ وسعت کے حدود میں تقلید۔ تعمیم میں تخصیص کی صورت تھی لیکن اب ایک اور
انقلاب ابھی باقی ہو اور وہ یہ کہ زمین سے مراد یہاں یہ کیا واقعی سطح خاک ہے یعنی
فساد جو ممنوع ہے وہ وہی ہے کہ جو اس سطح خاک کے رہنے والوں سے متعلق ہو لہذا اگر کوئی
شخص زمین سے نکلکر سمندر کی سطح میں جہاز کے تختہ پر بسر کرے تو وہاں فساد پیدا
کرنا اس حکم کی زد میں آنے سے قاصر ہو ؟ اگر کوئی فضا میں قیام کر سکے یا پرواز
کرتا ہو۔ وہاں فساد پیدا کرنا ممنوع نہیں ہو ایسا ہرگز نہیں ہو"۔

"ارض" سے مراد یہاں پر یہ سطح خاک نہیں ہو جو فضاؤ ہوا اور سمندر دریا سے
علٰحدہ ہو بلکہ زمین سے مراد دنیا۔ چونکہ اس دنیا کے رہنے والی مخلوقِ انسانی کی زیادہ تر
تعداد باعتبار اپنی افتاد طبع کے وہی ہو جو زمین پر سکونت رکھے۔ اسلئے زمین کی
لفظ کا اطلاق ہوا ہے مگر اُس میں یہ خصوصیت ملحوظ نہیں ہو جس سے سطح بحری اور
وسعت فضائی خارج ہو جائے۔

یہ تمام تصرفات معانی میں بالکل اصول محاورہ اور عام روزمرہ کے مطابق ہیں
اس لئے "تفسیر بالرائی" کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا کیونکہ تفسیر بالرائے اُن باطنی
معانی سے متعلق ہو جو کلام کے تحت اللفظی معانی سے بالکل علٰحدہ ہوں لیکن جہاں الفاظ

اس بدترین صفت کے حامل ہیں جس کی نسبت کو ہم اپنی طرف ہرگز گوارا نہیں کرسکتے اس طرح ایک دھکا ہے جو طبیعت انسانی کو بار بار پہونچے گا اور ایک ٹھیس ہے جو خاطر اصحاب کے نازک آبگینوں کو برابر لگے گی۔

بہرحال میرا موضوع یہی ہے اور مجھے اس کے متعلق بیان کرنا ہے اور چونکہ اسمیں کوئی شخصی بحث نہیں ہے بلکہ کلیات ہیں اور ایسے کلیے جو تمام دنیا کو شامل ہیں اور کرۂ ارض کے کسی قطعہ سے مخصوص نہیں ہیں کیونکہ تمام عالم کے اجزاء اپنے ضروریات کے اعتبار سے، اپنے مختلف حالات کے اعتبار سے اور ان اسباب کے لحاظ سے جو اُن کی ترقی کے لئے ضروری ہیں یا اُن کی تنزلی کا باعث ہیں ایک حد تک اشتراک رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی خاص قطعۂ ارض میں کم اور کہیں زیادہ لیکن بہرحال بحیثیت مجموعی اجزائے عالم اپنے میں فساد رکھتے ہیں۔ اب اس کا کسی کو برا نہ ماننا چاہیے۔

اس وقت تمام عالم ان مصیبتوں میں مبتلا ہے۔ کوئی خاص جماعت، کوئی خاص طبقہ، کوئی خاص محل اس کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ عالم کا ہر شخص اس کا طالب ہے کہ کسی طرح یہ مصیبتیں دفع ہوں کسی طرح امن وسکون، راحت و اطمینان کی زندگی نصیب ہو۔

اس وقت میں اگر کوئی شخص یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ امراض کیا ہیں اور ان کے دفعیہ کی کیا صورت ہے کیا تدابیر ہیں جن سے امن و اطمینان حاصل ہو اور وہ زندگی کا دور جو بے چینی کی حالت میں گذر رہا ہے وہ راحت وسکون کی صورت

کوئی انسان ایسا نہو گا جو اقرار کرے کہ میں فساد فی الارض کا مرتکب ہوں
گویا الفاظ ایسے ہیں کہ ناگواری انکی فطرت میں داخل ہے اور طبع انسانی پر گراں گذرنا
ان کا لازمی خاصہ ہے۔

اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان اصل فطرت کے لحاظ سے صلح پسند واقع ہوا ہے
یہ اسباب خارجی اور دوسرے حالات ہوتے ہیں جو فطرت صحیح پر پردہ ڈالدیتے ہیں اور
انسان کے ذاتی جوہر شرافت کو مدغم کر کے اُس کو فساد کے راستے پر گامزن کرتے ہیں۔
اسی لئے باوجود اسکے کہ وہ اس راستے کے سالک ہیں لیکن پھر بھی انہیں اُس کے
نام سے محبت نہیں پیدا ہوتی حالانکہ دنیا میں جو کسی مسلک کا راہرو ہو وہ اُس مسلک
کی حمایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ٹھیک ہی ہے۔ اسی وجہ سے اختلاف آراء پیدا
ہوتا ہے جس چیز کو آپ بد سے بدتر سمجھتے ہیں دوسرا اُس کو بہتر سے بہتر سمجھتا ہے
آپ سرمایۂ ننگ قرار دیتے ہیں وہ اُس کو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے۔

لیکن فساد فی الارض، یہ چیز ہی ایسی کہ لاکھ انسان اس راستے پہ
گامزن ہو لیکن وہ خود اُس سے نفرت ہی کرتا ہے۔

پھر ایسی چیز کے متعلق حاضرین کے سامنے روزانہ تفصیل ہوتی رہے، اس سے
ضرور طبیعت کو گریز ہونا چاہیئے خصوصاً جبکہ اسے عنوان کلام قرار دینا بتلا رہا ہے کہ
دنیا کو اس سبق کے یاد دلانے کی ضرورت ہے۔

اس کا نتیجہ ہونا چاہیئے کہ طبیعت انسانی پہ بار پڑے اور یہ احساس ہو کہ گیا ہم

یونہی "فساد فی الارض" زمین کے رہنے والے مخلوقات میں اگرچہ چرند بھی ہیں پرند بھی، نباتات بھی جمادات بھی مگر جس کا فساد معیاری حیثیت رکھتا ہے اور اس تمام وسیع دنیائے زمین میں جالب توجہ ہو وہ اہل ارض کے اسی طبقہ کا فساد جو حس و شعور اور تعقل و اختیار کے جوہروں کا حامل ہے یعنی انسان ۔

اب معلوم ہوگا کہ مفردات الفاظ کے معانی کی نسبت سے اس ترکیبی فقروں کے مفہوم میں کیا انقلاب ہو گیا ۔ الفاظ کی دنیا عجیب و غریب ہے ۔ اس میں معانی کے اعتبار سے نئے نئے انقلابات ہوتے رہتے ہیں ۔ جو شخص الفاظ کے بالکل ظاہری اصلی و ابتدائی معانی پر الفاظ کو محمول کرنے کی کوشش کرتا ہو اس کو افہام و تفہیم میں بڑے مشکلات سے دوچار ہونا لازمی ہے ۔

اس کا نتیجہ وہی ہوگا کہ حکیم صاحب کے اس ارشاد کی بنا پر کہ "جاؤ اس نسخہ کو جوش دیکر پی لینا" وہ بیچارہ دیہاتی اس لکھے ہوئے پرچہ کاغذ ہی کو لیجا کر جوش دیکر پی لے ۔ الفاظ کے اعتبار سے اس کا طرز عمل بالکل ٹھیک ہے ، اس لئے کہ نسخہ نام ہی پرچہ کا ہے ۔ دواؤں کا نہیں جو عطار کے یہاں سے آتی ہیں ۔ انسان اس طرح اپنی دنیائے روزمرہ میں زندگی نہیں گذار سکتا ۔

لا تفسدوا فی الارض ، کے مفہوم میں الفاظ کے انفرادی و سطحی معانی کو دیکھتے ہوئے انقلاب ہوا ۔ سب سے پہلے "زمین" سے مراد ہوئے "اہل زمین" یہ کسی عام مفہوم میں قیود کے ذریعے سے تحدید پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ مفہوم لفظ کو ایک بالکل

شہر تو اسی کا نام ہے مثلاً اگر کوئی واقعہ ایسا ہو کہ لکھنؤ کے تمام رہنے والے لکھنؤ چھوڑ کر دہلی
چلے جائیں تو بھی لکھنؤ اپنی جگہ ہی پر رہیگا۔ یہ نہیں کہا جائیگا کہ لکھنؤ دہلی پہونچ گیا
بلکہ لکھنؤ خالی ہو گیا اور لکھنؤ کے لوگ دہلی چلے گئے معلوم ہوا کہ لکھنؤ نام رہنے والوں کا
نہیں بلکہ اس رقبۂ زمین اور اسکے عمارات وغیرہ کا ہے لیکن جب آپ نے کہا کہ "تمام شہر
اس بات کا گواہ ہے" وہاں شہر سے مراد یہ در و دیوار نہیں ہیں کیونکہ وہ گواہی دینے سے
قاصر ہیں۔ اسی طرح آپ فرماتے ہیں "تمام شہر اس سے واقف ہے" "تمام شہر سے
اس کی تصدیق ہو سکتی ہے" وغیرہ وغیرہ یقیناً شہر سے مراد ان تمام مواقع پر شہر کے باشندے ہیں
"تمام دنیا اس کو جانتی ہے" "تمام ملک اس سے واقف ہے" "تمام صوبہ اس سے آگاہ
ہے" یہ تمام وہ الفاظ ہیں جو برابر ہماری زبان پہ آیا کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اسکی
نظیر ہے" واسأل القریۃ التی کنا فیھا والعیر التی اقبلنا فیھا وانا لصادقون"
حضرت یوسف کے قصہ میں ہے کہ ان کے بھائیوں نے حضرت یعقوب سے کہا آپ اس قریہ سے
پوچھ لیجیے جس میں ہم تھے" بالکل ظاہر ہے کہ "قریہ" سے مراد یہاں پر اہل قریہ ہیں۔
انہی مثالوں کے مطابق زمین کے صلاح و فساد سے مراد اہل زمین کا صلاح و فساد
پھر اہل سے مقصد وہ زمین کے اوپر کی مخلوق مراد نہیں جو ذی شعور نہ ہو۔ جیسے لکھنؤ
اس میں نباتات تھے حیوانات تھے مگر جو مخلوق ان میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا وہ
انسان ہے اس لئے یہ کہنے کا محل ہوا کہ تمام لکھنؤ واقف ہے حالانکہ واقفیت کا تعلق صرف
لکھنؤ کے رہنے والے ذی شعور طبقہ یعنی انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور اُن کے افرادی و ترکیبی معانی کا تعلق ہو کلام الٰہی کے مفہوم میں غور و خوض کرنیکا اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح دوسرے اہل زبان کے محاورات میں اور لفظی و عقلی قرائن کی بنا پر اُسی طرح معانی کا تعین کیا جا سکتا ہے جس طرح دوسرے الفاظ میں۔

اب لا تفسدوا فی الارض" کے معنی ان تمام انقلابات کے بعد کیا ہوئے؟

یہ کہ مجموعۂ عالم بشری کے فساد کا باعث نہو۔

اب اگر مجموعۂ عالم بشری کا فساد اُس طرح ہی جو ہم نے سابق میں بیان کیا کہ ایک فرد میں بھی اگر خرابی پیدا ہوئی تو وہ خرابی مجموعہ کی طرف عائد ہو گی اور اس لئے ہر فرد جو کسی بُرے فعل کا ارتکاب کرے وہ فساد فی الارض" کا مرتکب ہے اگرچہ اس بُرائی کا کوئی تعلق اُس کی ذات کے سوا کسی دوسرے شخص سے نہو۔

اگر ایسا ہو تو اس فساد و صلاح میں اس " فی الارض" کی قید کا کوئی منشا ہی نہیں" مجموع عالم انسانیت" کو محل فساد قرار دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں اب نتیجہ یہ ہو کہ تم خود فاسد نہو کسی طرح کا فساد پیدا نہ کرو۔

کیونکہ جب کسی صورت سے بھی خود فاسد ہوئے یا فساد پیدا کیا تو بہر حال یہ فساد "مجموع عالم" کی طرف راجع ہوا۔ پھر" مجموع عالم" کی قید لگانے اور " فی الارض" کے اضافہ کرنے کا نتیجہ؟

اب کونسا فساد ایسا ہے جو" فساد" تو ہو مگر" فساد فی الارض" کا مصداق نہو۔ کیونکہ بہر حال ہم اس مجموعہ کی فرد ہیں۔ اور بہر حال جو خرابی ہم میں پیدا ہو وہ

مبائن جداگانہ مفہوم پر محمول کرنا ہے پھر "اہل زمین" میں تحدید ہوئی کہ سب نہیں بلکہ مخصوص ذی شعور مخلوق یعنی انسان۔ اس طرح تمام زمین کے رہنے والے اشیاء جمادات نباتات حیوانات خارج ہوئے اور دائرہ ایک قسم سے مخصوص ہو گیا۔

بہ وسعت کے حدود میں تقیید۔ تعمیم میں تخصیص کی صورت تھی لیکن اب ایک اور انقلاب ابھی باقی ہے اور وہ یہ کہ زمین سے مراد یہاں پر کیا واقعی سطح خاک ہے یعنی فساد جو ممنوع ہے وہ وہی ہے کہ جو اس سطح خاک کے رہنے والوں سے متعلق ہو لہذا اگر کوئی شخص زمین سے نکلکر سمندر کی سطح پر جہاز کے تختہ پر بسر کرے تو وہاں فساد پیدا کرنا اس حکم کی زد میں آنے سے قاصر ہے؟ اگر کوئی فضا میں قیام کرسکے یا پرواز کرتا ہو۔ وہاں فساد پیدا کرنا ممنوع نہیں ہے ایسا ہرگز نہیں ہے"۔

"ارض" سے مراد یہاں پر یہ سطح خاک نہیں ہے جو فضاؤ ہوا اور سمندر و دریا سے علیحدہ ہو بلکہ زمین سے مراد دنیا۔ چونکہ اس دنیا کے رہنے والی مخلوق انسانی کی زیادہ تر تعداد باعتبار اپنی افتاد طبع کے وہی ہے جو زمین پر سکونت رکھے۔ اسلئے زمین کی لفظ کا اطلاق ہوا ہے مگر اس میں یہ خصوصیت ملحوظ نہیں ہے جس سے سطح بحری اور وسعت فضائی خارج ہو جائے۔

یہ تمام تصرفات معانی میں بالکل اصول محاورہ اور عام روزمرہ کے مطابق ہیں اس لئے "تفسیر بالرائے" کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا کیونکہ تفسیر بالرائے اُن باطنی معانی سے متعلق ہے جو کلام کے تحت اللفظی معانی سے بالکل علیحدہ ہوں لیکن جہاں الفاظ

اور بلا لحاظ خصوصیت عموم نوع بشری سے متعلق ہیں جس طرح "رفاہ عام" وہ کام ہیں جو عامۂ نوع بشر کو فائدہ پہونچانے کے باعث ہوں۔ ایک شخص کسی دوسرے انسان کی ذات کو کوئی فائدہ پہونچادے وہ "رفاہ عام" کا مصداق نہوگا۔ ایک شخص اپنے خاندان کی پرورش کرے اُسے "رفاہ عام" نہ کہیں گے۔ "رفاہ عام" آپ کہیں گے اُن کاموں کو جو بلا لحاظ خصوصیات مجموعۂ عالم انسانی کو فائدہ پہونچانے والے ہوں اور فایدہ عامہ کے باعث ہوں۔ اس کا نام ہے "رفاہ عام"

بس اسی سے آپ "فساد فی الارض" کا مفہوم سمجھ لیجئے۔

بلا لحاظ شخص۔ بلا لحاظ خصوصیت جو امور مفاد عامہ کے خلاف ہوں اُن کا ارتکاب کرنا دوسری لفظوں میں مفاد عامہ کے خلاف اقدام کرنا۔ مفاد عامہ کو صدمہ پہونچانا۔ اس کا نام ہے "فساد فی الارض"۔

اگر "رفاہ عام" کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں تو "فساد فی الارض" کے اس مفہوم کا سمجھنا بھی کوئی دشوار نہیں ہے۔ اب رہ گئی اس کی تفصیل کہ کون چیزیں اس مفہوم میں داخل ہیں اور کون خارج اس کے لئے آئندہ بیانات کے انتظار کی ضرورت ہے۔
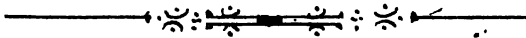
مجموعہ کی خرابی کا باعث ہوگی۔ ایک شخص جھوٹ بولا روئے زمین میں فساد ہوا یعنی اس انسان کو جو بھی نسبت مجموعۂ عالم انسانیت کے ساتھ حاصل ہو اسی نسبت کے لحاظ سے اس مجموعہ کی صلاحیت فنا ہوئی اور اس میں فساد کا گذر ہوا۔

اس طرح کوئی فساد ایسا نہیں مل سکتا جو "فساد فی الارض" نہ ہو۔

لیکن فساد میں اس قید کے اضافہ کا ہونا بتلاتا ہے کہ فساد دو قسم کا ہے ایک وہ "جو فساد" تو ہے مگر اس "مجموعۂ عالم انسانی" سے متعلق نہیں اور ایک وہ جو مجموعہ سے متعلق ہے۔

اس بنا پر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ "فساد فی الارض" سے مراد وہ فساد نہیں ہے جو باعتبار اجزا خواہ مخواہ اس مجموعہ کی طرف راجع ہو بلکہ اس فساد سے مراد وہ فساد ہے جو براہ راست اس مجموعہ ہی سے تعلق رکھتا ہو اور اس طرح وہ فساد جو براہ راست کسی جزء کے ساتھ متعلق اور کسی شخص کے ساتھ مخصوص ہے وہ "فساد فی الارض" کا مصداق نہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فساد کی دو قسمیں ہیں۔

ایک فساد انفرادی اور ایک فساد اجتماعی دوسرے الفاظ میں "فساد خاص" اور "فساد عام" بہت ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی انفرادی زندگی میں بداخلاقیوں کا مرتکب ہوتا ہو لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ فساد فی الارض کا مرتکب ہو۔ ممکن ہے کہ کوئی اپنے گھر کے اندر لڑتا بھڑتا بھی ہو یا مختلف اشخاص کو لڑواتا بھی ہو لیکن فساد فی الارض کا مرتکب نہ ہو۔ فساد فی الارض وہ خرابیاں ہیں جو بلا تخصیص طبقہ

اس کے معنی تھے "شئے پوشیدنی" یعنی چھپانے کے قابل چیز کے روایات میں صنف اناث پر یا اطلاق اسی توصیفی معنی کے لحاظ سے ہوا ہے مثلاً النساء عی وعورۃ صنف نازک کو عورت کہنا اس لحاظ سے تھا کہ اُن کے لئے پردہ لازم ہے لیکن ہم جب عربی میں "عورت" کی لفظ دیکھیں تو اُسی اپنی زبان کے معنی کی طرف ذہن منتقل ہو جائیگا اور وہ خصوصیت دماغ میں نہ آئیگی جو اصلی معنی کے لحاظ سے اس میں مضمر تھی۔

دوسری مثال "احسان" عربی لفظ ہے اور آپ کی زبان میں مستعمل ہے مگر آپ کی زبان میں آنے کے بعد اس میں ایک قسم کی منّت اور تفوق کا عنصر شریک ہوگیا ہے یعنی احسان کرنا، اس کے معنی ہو گئے ہیں دوسرے کے حقوق سے زیادہ یا بلا حق اسکے ساتھ کوئی حسن سلوک کرنا۔ اسی بنا پر آپ اس کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں "اوپر" کی لفظ کے ساتھ یعنی یوں کہتے ہیں کہ "فلاں پر احسان کیا" گویا ایک بار ہی جو محسن کی طرف سے دوسرے شخص کے کاندھوں پر آتا ہے۔ اب جس وقت عربی میں یہ روایت گوش زد ہوتی ہے کہ من بکی علی الحسین فقد احسن بالنبیؐ و فاطمۃ تو بیان کرنے والا بھی چھوٹتے یہ ترجمہ کرتا ہے کہ "جو شخص امام حسین پر رو دیا اُس نے احسان کیا رسالتمآبؐ اور حضرت فاطمہ زہراؑ پر" اور سننے والے بھی یہی سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ عربی میں "احسان" کے یہ معنی ہی نہیں ہیں۔ وہاں احسان کے معنی ہیں "حسن عمل" کے یعنی

ایک غلطی کا دفعیہ

"فساد" کے لفظ کا ہماری زبان میں جب اطلاق کیا جائے تو عام افراد کا ذہن منتقل ہوتا ہے نزاع، جنگ و جدال و رشورش و ہنگامہ کے معانی کی طرف۔ اس کے علاوہ فساد کے معنی اُن کے ذہن میں نہیں آتے۔

یہ حقیقتہً عربی الفاظ کے اُردو میں منتقل ہونے کے بعد جو تصرفات ہوئے ہیں اُن کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب کوئی لفظ کسی زبان سے دوسری زبان کی طرف منتقل ہوتا ہے تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اُسکے اصلی خصوصیات جو پہلی زبان میں تھے بالکل اُسی صورت پر محفوظ رہیں بلکہ اقتضائے طبع یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ اُس کے معانی میں تغیر ضرور ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو پہلی زبان سے تھوڑا بہت ربط رکھتے ہیں لیکن پورا اقتدار نہیں رکھتے اور دوسری زبان کے محاورات اُن کے دماغ میں بسے ہوئے ہیں، وہ جب اس لفظ کو اُس پہلی زبان میں دیکھتے ہیں تو اپنی مناسبت طبعی کی بنا پر اُن کا ذہن دوسرے معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر اکثر اردو داں طبقہ کے فاضل تک عربی کے ترجمہ میں ٹھوکر کھاتے ہیں وہ عربی کا ترجمہ کرتے ہیں اپنے اُردو محاورات کے موافق اس لئے وہ صحیح نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہو "عورت" کا لفظ یہ اصل میں عربی ہے اور آپ کی زبان میں نام ہے اس صنف خاص کا جو مردوں کے مقابل ہے لیکن عربی میں

اصل آیت کے مفہوم سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ ھل جزاء الاحسان سے ہمارے
ذہن میں جو مفہوم پیدا ہوتا ہے وہ صرف یہ کہ کسی کے ساتھ اگر ہم کوئی اچھائی
بطور احسان کریں مثلاً کسی کو دو روپیہ دیدیں تو اُسے بھی وقت پڑے پر ہماری
ایسی ہی امداد کرنا چاہیئے لیکن عربی کے اعتبار سے ان الفاظ کا مفہوم مخصوص اس
طرح کی اعانت کے ساتھ نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ "اچھے کام کا بدلا اچھائی
کے ساتھ ہونا چاہیئے"۔ بے شک وہ احسان جسے آپ نے اپنی زبان میں احسان قرار
دیا ہے وہ ایک فرد ہے اس احسان کی جسے آیت بتلا رہی ہے۔

تیسری مثال سلوک۔ اس کے معنی ہماری زبان میں ہو گئے ہیں کسی
کی مدد کرنا۔ برے طرز عمل کے لئے ضرورت قید لگانے کی ہے یعنی "بدسلوکی"
لیکن جب اس قید کو نہ لگایا جائے۔ یوں کہا جائے کہ فلاں شخص نے میرے ساتھ
سلوک کیا، تو اس کے معنی اچھے طرز عمل اور امداد و اعانت کے قرار پاتے ہیں حالانکہ
عربی زبان میں کہ جہاں سے یہ لفظ آیا ہے "سلوک" کے معنی ہیں کسی راستے پر
چلنا اور علم تصوف میں اصطلاح ہو گئی ہے مسلک طریقت و عرفان پر چلنے کی۔
اس کے علاوہ کثیر التعداد مثالیں ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عربی
سے آئے ہوئے الفاظ اردو میں اکثر اپنے اصل معانی کے خلاف مستعمل ہیں اور
اس بنا پر ترجمہ کرنے میں اکثر لوگوں سے غلطی ہوتی ہے اس لئے کہ اپنی زبان کے
مانوس معنی ذہن کو اپنی ہی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ان سے ذہن کے ہٹانے کیلئے

اچھی رفتار اختیار کرنا۔ نیک طرز عمل ظاہر کرنا اس لئے جو ترجمہ ہم نے روایت کا کیا وہ اُردو محاورہ کے مطابق ہوا لیکن اُس کو اصل روایت کے معنی سے کوئی تعلق نہیں اور پھر بجائے خود درست بھی نہیں۔ اسلئے کہ احسان وہ حسن سلوک ہے جو بغیر حق ہو۔ اسی بنا پر کسی کا کچھ قرضہ آپ کے ذمہ ہو اور آپ سے وقت پر ادا کر دیں اور وہ بطور شکریہ کہے کہ آپ کا احسان ہوا تو آپ فرمائینگے اس میں احسان کا ہے کا یہ تو آپ کا حق تھا جو ادا کیا گیا معلوم ہوا کہ احسان کے مفہوم میں بے حق ہونے کی خصوصیت مضمر ہے۔ تو کیا گریہ مصیبت سید الشہداء پر حقیقۃً بلا استحقاق ہے اور اُن کے حقوق سے زیادہ ہے؟ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک قرضخواہ کی زبان سے تو یہ سنکر کہ آپکا احسان ہوا ہمارے دل پر چوٹ لگے اسلئے کہ اس میں بے حق ہونے کا پہلو پایا جاتا ہے اور پیغمبر اسلام اور اُن کے اہلبیت ایسے حقدار حضرات کے لئے ہم اس نسبت کو گوارہ کریں کہ ہمارا احسان ہے اون کے اوپر۔

اسی طرح قرآن مجید کی یہ آیت کہ ھل جزآء الاحسان الا الاحسان یا یہ آیت کہ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین وغیرہ سنکر برابر ہمارے ذہن کو اردو معنی اپنی طرف کھینچ لیجاتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم ترجمہ میں اسی لفظ احسان کو دُہرا دیتے ہیں۔ یوں ترجمہ کرتے ہیں مثلاً کہ "احسان کا بدلا نہیں ہے سوائے احسان کے" اور "خدا نہیں ضایع کرتا احسان کرنے والوں کے ثواب کو" حالانکہ حقیقۃً ترجمہ میں اس احسان کی لفظ کے آنے نے ترجمہ کے مفہوم

اور لوگوں کو جنگ نہ کرنے کی ترغیب دینا فساد فی الارض ہوگا اور جنگ صلاح فی الارض ۔"

"فساد فی الارض" کے انواع واقسام

گذشتہ مفہوم کی بنا پر جمہور کے اندر کسی صورت سے خرابی پیدا کرنا اور مفاد عامہ کے خلاف کوئی اقدام کرنا فساد فی الارض ہے اس لئے اس کی تقسیم مختلف حیثیتوں سے ہوسکتی ہے

پہلی تقسیم } باعتبار اُن خرابیوں کے جو افراد جمہور میں پیدا کی جائیں اور اس کی حسب ذیل قسمیں ہیں ۔

(۱) دماغی وذہنی فساد (۲) معاشرتی واجتماعی فساد ۔

(۳) اخلاقی وعملی فساد (۴) سیاسی وتمدنی فساد ۔

دوسری تقسیم } باعتبار اُن صورتوں کے جو فساد کے لئے اختیار کی جائیں ۔ اس لحاظ سے دو صورتیں ہیں ایک وہ جو بغیر جنگ وپیکار کے رونما ہو ۔ دوسرے وہ جو مادّی ہتھیاروں سے اور جنگ وپیکار سے پیدا ہو ۔

تیسری تقسیم } باعتبار اُن اشخاص کے جو اس فساد کے ذمہ دار ہوں ۔ ان میں نمایاں جماعتیں جو فساد کی ذمہ دار ہوسکتی ہیں حسب ذیل ہیں ۔

(۱) علمائے ملت یعنی رہنمایان روحانی لیکن یہ ظاہر ہے کہ علماء حقیقی کبھی فساد کے باعث نہیں ہوتے اسلئے مراد علمائے سے یہاں وہ طبقہ ہے جو عام طور پر "علماء" کے نام سے

ضرورت ہے کہ عربی زبان کے محاورات کے ساتھ ذہن کو اتنا انس و محبت پیدا ہو جائے کہ اپنی زبان سے پیدا شدہ خصوصیت اُس پر غلبہ حاصل نہ کرے۔ اس صورت میں عربی زبان کے الفاظ کو انسان اردو محاورات کی روشنی میں نہیں بلکہ اصل عربی محاورات کے مطابق سمجھنے کے قابل ہوگا اور صحیح ترجمہ کریگا۔

"فساد فی الارض" کے مفہوم میں بھی یہی صورت پائی جاتی ہے۔ ہماری اُردو زبان میں "فساد" کے معنی ہو گئے ہیں لڑائی جھگڑا۔ ہنگامہ، شورش، جنگ و جدال وغیرہ اور اس لئے جب ہم "فساد" کی لفظ عربی میں بھی دیکھتے ہیں تو یہی معنی سمجھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ "لاتفسدوا فی الارض" کا ترجمہ کرتے ہیں "زمین خدا میں فساد برپا نہ کرو" یہاں ایک تو ہم نے فساد کی لفظ کا اعادہ کر دیا جو اُردو میں جنگ و جدال ہی کے معنی کا حامل ہے دوسرے اس کیساتھ ضمیمہ لگا یا "برپا نہ کرو" کے لفظ کا اور ظاہر ہے کہ "برپا کرنا" معرکہ، ہنگامہ، شورش، جنگ اور فتنہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے لیکن عربی زبان کے محاورہ کے لحاظ سے فساد اس مفہوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ "فساد" کے معنی ہیں خرابی اور "فی الارض" کے تعلق کے بعد اُس کا مفہوم ہو گیا وہی کہ مفاد عامہ کے خلاف اقدام کرنا۔

فتنہ و فساد وغیرہ جسے اُردو میں "فساد" کی لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ بھی مفاد عامہ کے خلاف ہونے کی بنا پر فساد کی ایک قسم قرار پا سکتا ہے لیکن فساد کا مکمل مفہوم نہیں کیونکہ بعض اوقات جبکہ جنگ مفاد عامہ کے موافق ہو تو وہاں ترک تعاون کرنا

چوتھی تقسیم } باعتبار دواعی واغراض کے۔ فساد کرنے والے کا محرک فساد پر کبھی فائدہ کا حصول ہوتا ہے اپنے نفس، اپنے خاندان، اپنے کسی مخصوص شخص یا جماعت کیلئے اور کبھی صرف جذبۂ انتقام جس میں کسی دوسرے کو تکلیف پہونچانا مقصود ہوتا ہے اور اس سے کوئی نفع بھی اپنا یا کسی کا حاصل نہیں ہوتا اور تیسری قسم فساد کی عجیب وغریب ہے کہ فساد کا مقصد کچھ بھی نہ ہو سوائے مفسدہ پسندی اور ہنگامہ پروری کے۔ یہ انسان دنیا کے اضطراب سے لطف حاصل کرتا ہے اور فساد سے اسے مسرت حاصل ہوتی ہے جس میں نہ خود اس کو اپنا کوئی فائدہ مدنظر ہے اور نہ کسی خاص شخص یا جماعت کو کوئی نقصان پہونچانا مقصود۔ یہاں فساد کا مقصد بس فساد ہی ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔

یہ فہرست ہے فساد کے اقسام کی جن کی تشریح حتی الامکان آئندہ کی جائیگی۔

فسادِ شخصی اور فسادِ نوعی کا باہمی تعلق

میں نے سابق میں مجملاً بیان کیا ہے کہ شخصی بداخلاقیاں اور ذاتی ضرر رسانیاں فساد کے حدود میں داخل نہیں ہوتی ہیں لیکن یہ اسی وقت تک ہے، جبتک وہ بداخلاقی محدود حیثیت رکھے لیکن یہ بداخلاقی اگر متعدی شکل اختیار کرلے تو وہ فساد فی الارض میں داخل ہو جائیگی۔ شلاً فرائض انسانی کے دو شعبے ہیں حقوق اللہ اور حقوق الناس، گذشتہ بیان کے لحاظ سے حقوق اللہ کم از کم بالکل انفرادی شخصی اور مابین خود وخدا حیثیت رکھتے

یاد کیا جاتا ہو لیکن اس میں بہت سے جھوٹے اور کھوٹے موجود ہوں اور فساد ہمیشہ انہی جھوٹے افراد کے ہاتھ سے رونما ہوتا ہے۔

(۲) زعمائے قوم یعنی رہنمایان سیاسی؛ یہ بھی اگر مخلص اور سچے بہی خواہ ہوں تو ان سے فساد رونما نہ ہو لیکن ان میں بھی چونکہ اکثر ریاکار۔ ظاہردار اور خود غرض ہوتے ہیں اسلئے وہ فساد کا باعث ہوتے ہیں۔

(۳) سلاطین و ملوک؛ ان کا فساد بزور طاقت ہوتا ہے اس لئے بہت مؤثر ہوتا ہے۔

(۴) خطبا و مقررین؛ یہ لوگ قوم کے مزاج عقلی میں بہت حد تک دخیل ہوتے ہیں اسلئے صلاح و فساد کی ذمہ داری ان پر بہت زیادہ عائد ہوتی ہے۔

(۵) شعرا، ان لوگوں کا اثر اس زمانہ میں زیادہ ہوتا ہے جب شاعری صرف تفریح طبع کا ذریعہ بنالی گئی ہو لیکن موجودہ زمانہ میں اس کا اثر بہت کم رہگیا ہے اسلئے کہ وہ صرف ذریعہ تفریح قرار دی گئی ہے۔

(۶) اخبارات۔ یہ اس زمانہ میں قوم کے خیالات میں بہت زیادہ انقلابات کا سبب ہوسکتے ہیں۔

ان اقسام میں پہلی اور تیسری قسم کا فساد بہت مؤثر، ہمہ گیر اور دیرپا ہوتا ہے جن میں سے پہلا زیادہ تر دماغی و ذہنی اور اخلاقی و عملی ہوتا ہے اور دوسرا سیاسی و تمدنی اور معاشرتی و اجتماعی لیکن بہرحال ان میں سے ہر ایک زندگی کے تمام شعبوں پر کسی نہ کسی حد تک اثر کئے بغیر نہیں رہتا اور دوسرے فسادات ان کے مقابلہ میں جزئی حیثیت رکھتے ہیں اور اس قدر مؤثر نہیں ہوتے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ عقیدہ اگرچہ انفرادی بلکہ باطنی چیز ہے جو صرف انسان کے ضمیر و دل سے متعلق ہے لہذا اگر کوئی غلط سے غلط عقیدہ اپنے دماغ میں محدود رکھے تو وہ صرف اپنے اس خیال کی بنا پر کسی "فساد" کا مرتکب نہیں قرار دیا جاسکتا مگر یہ اسی وقت تک جب وہ اس کے دماغ تک محدود رہے اور اگر اس نے متعدی شکل اختیار کی یعنی اس عقیدہ کی نشر و اشاعت کرنا چاہی۔ دوسروں کو بھی بنا ہم نوا بنانا چاہا اور ان کے مزاج عقلی کو خراب کرنا چاہا تو ایسا شخص مفسد کی تعریف میں داخل ہو جائے گا جس کے بعد مفاد عامہ کیلئے اس کی زبان بندی کرنا عین صلاح ہوگی۔

یہ "حقوق اللہ" کا تذکرہ تھا۔ اب دوسرا شعبہ یعنی حقوق الناس، میں نے بیان کیا تھا کہ جہاں تک انفرادی حیثیت رکھیں "فساد فی الارض" کی تعریف میں شامل داخل نہوں اور اس لئے ممکن ہے کہ بڑے سے بڑا ظلم جو دوسرے انسان پر ہو یہاں تک کہ قتل نفس، اگر اس کا عام افراد کیساتھ کوئی تعلق نہیں ہے تو وہ انفرادی حدود سے متجاوز نہیں سمجھا جاسکتا لیکن جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو یہ چیز باعتبار خصوصیات و نتائج مختلف ہے۔

کوئی ایک فرد ایسی ہوتی ہے کہ اس سے مفاد عامہ کا تعلق ہے، اس فرد کو کسی طرح کی ایذا پہونچانا تکلیف دینا اگرچہ بجائے خود شخصی جرم ہے لیکن چونکہ اس سے مفاد عامہ کو بھی نقصان پہونچتا ہے اسلئے وہ فساد فی الارض میں داخل ہوگا۔

اسی طرح چند آدمیوں میں مثلاً جو ایک محدود جگہ پر رہتے ہیں جھگڑا اور نزاع

ہیں۔ ایک شخص بذات خود نماز نہیں پڑھتا۔ یا روزہ نہیں رکھتا یا کسی ایسے فعل حرام کا مرتکب ہوتا ہے جس کا کوئی تعلق خلق خدا کے ساتھ نہیں ہے تو ایسا شخص گنہگار ہے، عاصی ہے مگر اس کو فساد فی الارض کا مرتکب نہیں کہا جائیگا۔

لیکن اگر یہی متعدی شکل اختیار کرے ایک شخص خود نماز نہیں پڑھتا اور اس کے ساتھ ترغیب بناتا ہے نماز نہ پڑھنے کی۔ خود روزہ نہیں رکھتا۔ اور دوسروں کو روزہ رکھنے سے روکتا ہے، روزہ پر مضحکہ کرتا ہے۔ اسکی خرابیاں بیان کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ روزہ عربوں کے لئے تھا اُس زمانہ میں جبکہ وہ جسمانی طور پر طاقت اور قوت رکھتے تھے لیکن ہم لوگ کمزور اور ناتواں ہیں ہم لوگوں کو روزہ کے حکم کے کوئی معنی نہیں۔ اس طرح لوگوں کو اُس غلط راستے کا سالک بناتا ہے جس پر وہ خود گام زن ہے جب تک وہ خود اُس راستے کا سالک تھا اُس کو روئے زمین کی اجتماعی حیثیت سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ادھر اُس نے اپنے اس غلط مسلک کی نشر و اشاعت کی اور اپنے شخصی عمل کو نوعی بنانا چاہا ادھر وہ فساد فی الارض میں داخل ہوا۔

یہ فساد اکثر پہلی تقسیم کے لحاظ سے معاشرتی و اخلاقی، اور کبھی اجتماعی و تمدنی ہوتا ہے اور کم از کم ذہنی و دماغی، یعنی اگر اُس غلط راستے سے جس کا وہ دوسروں کو بھی سالک بنا رہا ہے ہیئت اجتماعی کی معاشرت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تمدن پر کوئی اثر نہیں پڑتا تب بھی کم از کم ایک غلط خیال لوگوں کے دماغ میں راسخ ضرور ہوتا ہے اور اس طرح ایک فساد ہے جو اس کے ہاتھوں خلق خدا میں منتشر ہوتا ہے

مصلح اور مفسد کا تفرقہ

"صلاح" اور "فساد" کے حدود کا تعین بہت آسان تھا اگر دونوں کا دائرہ ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتا۔

مگر دشواری یہ ہے کہ جو چیزیں ایک وقت میں صلاح فی الارض ہوتی ہیں وہی دوسرے وقت فساد فی الارض۔ مثلاً قتل نفس جو فساد فی الارض کا مصداق ہوتا ہے یہی کبھی اصلاح خلق کا ذریعہ۔ جنگ جو فساد ہے وہی کبھی صلاح۔ اسیطرح ایذا، ظلم و تعدی کی حیثیت سے فساد اور تادیب و تعزیر کی حیثیت سے صلاح۔

اب ذرا دشوار ہے کہ صلاح اور فساد کے حدود کا تعین بالکل الگ الگ کردیا جائے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر مصلح مفسد ہونے کے الزام سے دوچار اور ہر مفسد مصلح ہونیکا دعویدار ہوتا ہے۔ مصلح اپنے طریقۂ کار میں وعظ و نصیحت، زجر و توبیخ، سرزنش و ملامت کرتا ہے تو مفسد بھی مصلح بنکر یہی طریقے اختیار کرتا ہے۔ اس سے اگر کہئے کہ تم مفسد ہو تو وہ ماننے کے لئے طیار نہوگا۔ وہ کہیگا کہ میں دنیا کو ان غلط طریقوں سے جن پر وہ چل رہی ہے ہٹانا چاہتا ہوں اور صحیح راستے پر لگانا چاہتا ہوں اسلئے میں مفسد نہیں ہوں بلکہ مصلح ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر مفسد ہمیشہ مصلح سمجھا جا سکتا ہے اور ہر مفسد مصلح بن سکتا ہے۔

حقیقتاً یہ دونوں مرجداگانہ ہیں اور اپنے اپنے ضمیر کے اعتبار سے بھی

پیدا کرادینا ممکن ہو لا تفسد وافی الارض میں داخل نہو، بے ثبات وہ فتنہ ہے جیسے کہا گیا ہے الفتنۃ اشد من القتل لیکن فساد فی الارض تو اُسو قت ہے جب اُس سے عمومی حیثیت سے مفاد اجتماعی کا تعلق ہو لیکن بہت ممکن ہے کہ چند اشخاص ایسے ہوں جن کے آپس میں ملے جلے رہنے ہی پر نظام دنیا موقوف ہو ان چند اشخاص میں آپس میں پھوٹ ڈالدینا اور جھگڑا کرادینا فساد فی الارض کی نمایاں مثال ہوگی ۔

فرض کیجئے ایک انسان دو ملک کے بادشاہوں میں تصادم کرادے ۔ ظاہر ہے کہ باعتبار شخصی حیثیت کے تو وہ دو انسان ہی ہیں لیکن دو انسان ایسے ہیں جن کا متصادم ہو جانا گویا زمین کے دو قطعوں کا باہم دیگر ٹکرا جانا ہے پھر اس سے بڑھکر "فساد فی الارض" اور کیا ہوگا ۔

کسی کا مال لے لینا اور لوٹ لینا ممکن ہے کہ اگر شخصی حیثیت تک محدود رہے تو اس عنوان کے تحت میں داخل نہو لیکن ایک رہ زن جو اپنا پیشہ ہی بنا لیتا ہے ۔ قافلوں کی گذرگاہ میں سر راہ بیٹھتا ہے اُس کو کسی کی خصوصیت مد نظر نہیں ہے ۔ جو بھی اُدھر سے گذریگا اُس کو لوٹ لیگا ۔ یہ یقیناً "فساد فی الارض" کا مرتکب ہے اسی طرح ایک باطل راستے کی طرف دعوت دینے والا وہ مسلک حق کا راہزن ہے ۔ راہ زن کا جرم ہلکا نہیں ہوگا ۔ اگر اتفاق سے کوئی اس راستے پر نہ گذرا اور اسکی راہ زنی کا ارادہ پورا نہوا اسی طرح اُس داعی باطل کی مفسدانہ حیثیت پر کوئی اثر نہ پڑیگا اگر اسکے کہنے میں کوئی نہ آیا اور اسکی بات بے اثر ثابت ہوئی ۔

اور دوسرے فریق کی طرف سے اس کا عکس ہے یعنی وہ اس کو مفسد کہہ رہی ہے۔

اسکے بعد فریق ثالث جو ان دونوں سے علیحدہ ہے وہ کس طرح امتیاز کرے کہ کون مصلح ہے اور کون مفسد؟

اب اگر انسان اس کشمکش فکر سے گھبرا کر غور کرنے ہی کی زحمت نہ برداشت کرے اور ایک مصلح کی آواز کو صرف اس بنا پر ناقابل اعتبار سمجھے کہ ممکن ہے یہ مفسد ہو تو پھر مصلحین حقیقی کے لب خشک ہو جائیں، آوازیں پڑ جائیں، کوششیں بیکار ہو جائیں اور ان کی آواز پر کوئی لبیک ہی نہ کہے اور دنیا کی اصلاح کا مقصد فوت ہو جائے۔

یہی وجہ تھی کہ اسلام نے دنیا میں آکر یہ نہیں کہا کہ جو میں کہتا ہوں وہ مان لو بلکہ یہ کہا کہ جو کہتا ہوں اسے سمجھ لو۔ یاد رکھئے گا کہ یہ ایک بہت بڑا معیار ہے مصلح کی سچائی کا۔ اگر مصلح دنیا کو یہ سمجھاتا ہے کہ آنکھیں بند کر لو۔ کانوں پر پردے ڈال لو اور میری شخصیت سے مرعوب ہو کر میری بات کو تسلیم کر لو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اصلاح میں کھوٹ ہے اور اگر مصلح اپنے لائحہ عمل کو یہ کہہ کر پیش کرتا ہے کہ جو کہتا ہوں اسے عقل سے سمجھو اور غور کر کے اگر ماننے کے قابل دیکھو تو مانو یعنی وہ دنیا کی عقلی طاقتوں کو بیدار کرتا ہو وہ شبہات کے پردوں کو جو پڑے ہوئے ہیں اٹھاتا ہو۔ تو معلوم ہوگا کہ اسے اپنی سچائی پر بھروسا ہے اور اسکے ساتھ وہ خیر خواہ خلق ہے۔ بدخواہ نہیں ہے۔ اب یہ دنیا کا فرض ہے کہ وہ اسکی تعلیم و ہدایت پر غور کرے اور آیات حقیقت کی تلاش کرے۔

اسکے برخلاف اگر کوئی جماعت ایسی کھڑی ہوئی جس نے اس داعی اصلاح کی

ہر ایک یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم مفسد ہوں یا مصلح لیکن دشواری تو دوسرے لوگوں کے لئے ہے کہ وہ کس کو مصلح سمجھیں اور کس کو مفسد ۔

جبکہ دیکھا جاتا ہے کہ فساد کا الزام طرفین سے ایک دوسرے کی جانب عائد ہوتا ہے۔ ایک مصلح دعوت دیتا ہے وہ دنیا کو غلط راستے کا سالک دیکھکر اسے صحیح راستے پر لانے کی کوشش کرتا ہے، اسلئے اصلاح کا علم بلند کرتا ہے لیکن مفسدین اس پر فساد کا الزام لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم خاموش فضا میں تلاطم اور پرسکون ماحول میں اضطراب پیدا کر رہے ہو اسلئے مفسد ہو اور خود ان کو اگر کہا جائے کہ تم مفسد ہو تو وہ کہیں گے کہ نہیں ہم درحقیقت مصلح ہیں ۔

قرآن مجید میں اس کا تذکرہ موجود ہے ۔ واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون " جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد پیدا نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں (اسکے جواب میں کہا جا رہا ہے کہ) معلوم ہونا چاہیئے کہ مفسد یہی لوگ ہیں لیکن یہ بھولے بنتے ہیں اور گویا اپنی مفسدہ پردازی کی ان کو خبر نہیں ہے "

اب خدا پر ایمان ہے۔ اس کی کتاب پر ایمان ہے اس لئے یقیناً وہ لوگ مفسد اور ان کے دعاوی اصلاح غلط ۔ لیکن اگر متکلم سے قطع نظر کر لیا جائے تو صورت حال صرف اتنی ہے کہ ایک جماعت اپنے تئیں مصلح بتا رہی ہے اور دوسرے فریق کو مفسد

نظام عالم کی بنیاد حرکت پر ہے اور حرکت بے اجزا وقت و احا میں مجتمع نہیں ہوتی دنیا ایک رفتار پر جاری ہے اور رفتار کی بنیاد اُن قدموں پر ہے جن سے راستہ طے کیا جاتا ہے اور ہر بعد میں آنیوالا قدم اُسوقت تک نہیں سکتا جبتک پچھلا قدم موجود ہو کر فنا نہو جائے۔

اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر عمارت کا اس دنیا میں قائم ہونا موقوف ہے کسی دوسری عمارت کے خراب ہونے پر ہر چیز جو وجود میں آتی ہے وہ مترتب ہے کسی چیز کے معدوم ہونے پر یہ سلسلہ عدم و وجود کا جاری ہے جو ایک نظام کی صورت میں قائم ہے۔

اس طرح یہ کہنے کا محل ہے کہ اس عالم کی بنیاد فنا و زوال پر ہے اور اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ لہذا اگر ہم اس دنیا کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں تو جبتک کسی عمارت کو خراب کرنے کی کوشش نہ کریں جس وقت تک کسی بنیاد کو فاسد نہ کریں اور جبتک کسی نقش کو محو نہ کریں اُسوقت تک اس نئے نقش کو جسے ہم اصلاح کے نام سے موسوم کرتے ہیں قائم نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد تعمیر اور تخریب کے حدود مشترک ہو جاتے ہیں اور اسکی بنا پر ہی مصلح اور مفسد کا تفرقہ دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر صلاح اور فساد کی صورتیں بالکل جداگانہ ہوتیں یعنی صلاح کسی شے کا عالم نیستی سے ہستی میں لانا ہوتا اور فساد کسی شے کا ہستی سے نیستی کی طرف منتقل کرنا تو آسان تھا کہ تعمیر اور تخریب کے جدا جدا حدود قائم کر سکیں جہاں کوئی نیا نقش قائم کیا گیا یہ تعمیر ہے اور جہاں کسی بنیاد کو منہدم کیا گیا یہ تخریب ہے

صدا ہی کو خاموش کرنا ۔ [illegible] تو مصلح ہوگا اور یہ لوگ مفسد۔

تجدد و انقلاب پر حکیمانہ نگاہ

اور

شریعتِ اسلام کی جامعیت کا اصلی فلسفہ۔

اصلاحی کوششوں کے تعمیری ہونے کا معیار

عالم کی بنیاد کون و فساد پر ہے، دنیا کا کوئی نقش قائم نہیں ہوتا جبتک پرانا نقش مٹ نہ جائے کوئی نئی دیوار کھڑی نہیں ہوتی جبتک پرانی دیوار منہدم نہ ہوجائے عالم کائنات کے سمندر کی مضطرب سطح پر تازہ حبابوں کے خیمے لگتے نہیں جب تک پرانے ڈیرے اکھڑتے نہیں اس دنیا کی بستی میں آنے والے قافلے اسوقت تک آ نہیں سکتے جبتک گذشتہ قافلے منزل عدم کیجانب رہ سپار ہوکر اُن کے لئے جگہ خالی نہ کریں۔ اگر دنیا کی سب سے پہلی پیدا ہونیوالی مخلوق اُسی حالت پر قائم رہتی جس طرح پیدا ہوئی تھی تو یہ گوناگون طلسماتی نقوش جو ہماری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں اور تاریخ کے ورق کیسا نہ اُلٹتے جاتے ہیں ہماری آنکھوں کے سامنے نہ آتے ۔

تغیر و تجدد ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

پھر معیار کیا ہے اصلاح اور افساد۔ تعمیر اور تخریب کا؟ معیار یہ ہے کہ انسان قدیم اور جدید کا موازنہ نہ کرے اُس عمارت میں جواب تک قائم ہے اور اُس عمارت میں جس کا نقشہ دماغ میں اسکے بجائے تجویز کیا گیا ہے ان دونوں میں باعتبار مفاد عامہ تقابل کرے اور یہ دیکھے کہ ان میں سے کون ضروریات کے زیادہ مطابق ہے۔

اگر موجودہ عمارت ایسی خرابیاں رکھتی ہے جن کی بنا پر یہ ضروریات کے لئے ناکافی ہے اور مجوزہ عمارت ان نقائص سے خالی ہے تو بے شک وہ کوشش جو اس عمارت کی تخریب کی صورت میں کی جائیگی وہ نتیجۃً تعمیر ہوگی اور اگر ہم نے دیکھا کہ یہ عمارت جو اسوقت موجود ہے ہر حیثیت سے مکمل ہے۔ اس میں خرابی موجود نہیں ہے اور وہ تجویز شدہ عمارت جو ذہن میں ہے اپنے فوائد کے اعتبار سے کوئی ترجیح اس موجودہ عمارت پر نہیں رکھتی تو اس صورت میں موجودہ عمارت کو خراب کرنا ہرگز تعمیر نہیں کہا جا سکتا۔

اب اگر وہ عمارت جو نگاہ میں ہے اپنی مضرتوں کے اعتبار سے موجودہ عمارت سے بدتر ہے تو انقلابی کوشش کرنا خالص تخریب ہوگی اسی طرح اگر وہ عمارت بننے کے بعد موجودہ عمارت کے مساوی ہوگی لیکن اس عمارت کے گرنے اور اُس عمارت کے بنکر طیار ہونے تک اتنا وقفہ ہوگا جس میں انسانی ضروریات ضائع و برباد ہو نگے اور اُن کا کوئی خاطرخواہ معاوضہ بھی حاصل نہو سکے گا تب بھی موجودہ عمارت کے برباد کرنے کی کوشش تعمیری مفاد کے خلاف ہو گی۔

لیکن جبکہ طریق عمل کے لحاظ سے، صورت کارگذاری کی حیثیت سے مصلح اور مفسد کا طرز عمل ملتا جلتا ہوا ہے یعنی جو مصلح ہے وہ بھی ایک صورت حال کو فنا کرتا اور دوسری صورت حال کو اُس کے بجائے قائم کرتا ہے اور جو مفسد ہے وہ بھی یہی کرتا ہے تو اب تمیز بہت دشوار ہوگئی کہ کون تعمیر کر رہا ہے اور کون تخریب؟

ہم دو شخصوں کو دیکھ رہے ہیں کہ دونوں پھاوڑا ہاتھ میں لئے ہوئے بنی بنائی ہوئی عمارت پر چلا رہے ہیں۔ ظاہری صورت کی بنا پر بہت آسان ہے یہ کہہ دینا کہ دونوں تخریب کر رہے ہیں یعنی ایک بنی ہوئی عمارت کو برباد کر رہے ہیں لیکن ہمیں کیا معلوم کہ ان میں سے کون اس عمارت کو اس غرض سے شکستہ کرتا ہے کہ اُس کے بجائے ایک بہتر عمارت قائم کرے اور کون اس غرض سے نہیں۔ یہ تو نتیجہ سے متعلق ہے اور نتیجہ مستقبل کے ساتھ وابستہ۔

اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ قدامت پرستی اور تجدد پروری کی جنگ جو آپکے درمیان جاری ہے کس قدر لاحاصل اور بے معنی ہے اسلئے کہ تجدد صرف اس حیثیت سے کہ وہ تجدد ہے نہ قابل ستائش ہے اور نہ قابل ملامت کیونکہ عالم کی بنیاد تغیر پر ہے اور اسی لئے زمانہ کا وصف ہے، "نیرنگ"

قدیم قائم شدہ عمارت صرف قدیم ہونے کی بنا پر مورد ستایش نہیں بن سکتی اس لئے کہ ممکن ہے اُس میں ضرورت اصلاح ہو اور اصلاح کی بنیاد تجدید ہی پر ہے اور نہ مورد ملامت ہی بن سکتی ہے کیونکہ ممکن ہے اُس کا بدلنا تخریب ہو اور تخریب بھی

اس کے علاوہ ضرورت ہے اس بات کی کہ یہ انسان عقل و تدبر کے اعتبار سے اتنا کمال بھی رکھتا ہو جتنا اس عمارت کے تعمیر کرنے والے میں کمال کی ضرورت ہے۔

میں ایک عمارت دیکھتا ہوں۔ خود کبھی ایک اینٹ سے ملا کر دوسری اینٹ رکھنا بھی نہیں سیکھا مگر اس عمارت کو دیکھ کر میں نے فرفر نقائص بیان کرنا شروع کر دئے۔ یہ چیز یہاں ہوتی تو بہت اچھا تھا اور یہ چیز بجائے اسکے ہوتی تو بہت اچھا۔ یہاں یہ یہ کسر ہے اور یہاں پر یہ یہ نقصان لیکن اگر مجھ سے کہا جائے کہ جناب نقائص نکال دیں تو میں کہوں گا کہ کوئی میں معمار تھوڑی ہوں۔

اگر میرا اعتراض صرف اعتراض تک محدود ہے تو غنیمت ہے لیکن اگر میں نے جد و جہد بھی شروع کر دی اور اس عمارت کو رفتہ رفتہ گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ یہ میرے ہاتھ کی بات تھی اس لئے کہ گرانے کے لئے کسی کاریگری کی ضرورت نہیں ہے لیکن جب مجھ سے کہا گیا کہ اب اس عمارت کو بنا بھی دیجئے تو میں نے کہا اس کا میں ذمہ دار تھوڑی ہوں۔ اس کے بجائے دوسری عمارت قائم کرنا میرے بس میں تھوڑی ہے۔ اب تلاش شروع ہوئی کہ معمار لائے جائیں۔ اتفاق سے معمار اس جگہ غیر موجود دوسرے ممالک سے معمار بلا کر لائے گئے۔

فرض کیجئے کہ انھوں نے برسوں کی طویل مدت میں پھر تعمیر کر بھی دی لیکن اس دوران میں جو نقصانات ہوئے۔ جو ضروریات عالم انسانی فوت ہوئے اور جو مقاصد حیات پامال ہوئے اُن کا ذمہ دار کون ہے۔

اگر اس میں کوئی اور نقصان نہو تو یہی کیا کم ہے کہ موجودہ عمارت قائم شدہ موجود ہے اور وہ عمارت ابھی حدود خیال میں اور صرف متوقع ہے بہت ممکن ہے کہ ہم اس وقت اس موجودہ عمارت کو گرا دیں اور پھر ہم کو موقع اُس دوسری عمارت کے کھڑے کرنیکا نہ ملے تو نتیجۃً ہم نہ ادھر کے رہیں نہ اُدھر کے۔

اس طرح اقتضائے عقل یہ ہے کہ موجودہ حالات کے خلاف جو بھی قدم جس وقت کیا جائے وہ انتہائی غور و خوض کا نتیجہ ہو اور ہرگز کسی سطحی نظریہ یا سرسری نگاہ پہ مفاد عامہ کی قسمت کا فیصلہ نہ کیا جائے۔

اگر کہنے والا موجودہ عمارت کی خرابیاں بیان کرتا ہے لیکن کوئی مکمل خاکہ نہیں رکھتا جو اس عمارت کے خراب کرنیکے بعد بر سر کار لایا جائے۔ وہ جن کی زبان اعتراضات کرتے وقت تیزی کے ساتھ چلتی ہے لیکن جب اُن سے پوچھیے کہ آپ اس کے خلاف کوئی مکمل نقشہ بتائیے تو اس وقت اُن کی زبان لکنت کرتی ہے، اُن کے لب خشک ہونے ہیں اور اُن کی آواز میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے اس لئے کہ اُن کے دماغ میں خود کوئی مکمل نقشہ موجود نہیں ہے جو اس عمارت کے بجائے قائم کیا جائے جو ان تمام ضروریات کو پورا کرے جو اس وقت پورے ہوتے ہیں اور ان تمام نقائص سے پاک ہو جو اسوقت بیان کئے جاتے رہیں۔

ایسے لوگوں کا طرز عمل یقیناً تخریبی ہے اور یہ لوگ نتیجہ کے اعتبار سے مفسد ہیں اگرچہ وہ خود اس کو سمجھتے نہوں۔

عین فساد فی الارض ہوگا۔

قرآن نے ہمارے سامنے اس حقیقت کو کہ صلاح بھی تجدید سے ہوتی ہے اور تخریب بھی تجدید کا نتیجہ ہوتی ہے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم "خدا نہیں تغیر دیتا اس شے میں جو کسی قوم کے اندر ہے جب تک وہ خود تغیر نہ دیں اس شے میں جو انکے نفوس کے اندر ہے"

ممکن تھا کہ اس "شے" کی جگہ کوئی لفظ رکھ دیا جاتا لیکن اگر کوئی لفظ رکھ دیا جاتا تو مفہوم محدود ہو جاتا اور وہ زندگی کے خوشگوار یا ناخوشگوار کسی ایک پہلو سے مخصوص ہو جاتا۔ اس صورت میں اگر یہ مفہوم ہوتا کہ خدا کسی خیر و برکت کو نہیں بدلتا جب تک حالات میں تبدیلی نہ کی جائے تو نتیجہ صرف یہ نکلتا کہ فساد نتیجہ ہے تجدد کا اور اگر یہ مفہوم ہوتا کہ خدا کسی بری حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک ذاتی حالات میں تبدیلی نہ ہو تو نتیجہ یہ ہوتا کہ اصلاح بغیر تجدد نہیں ہوتی لیکن قدرت نے معینہ الفاظ کو چھوڑتے ہوئے ابہام کو اختیار کیا معانی میں وسعت پیدا کرنے کے لئے۔ یہ عجیب لطف ہے کہ لفظ کی زیادتی معنی میں کمی کا باعث ہوتی ہے مگر یہاں لفظ کی کمی نے معنی میں وسعت پیدا کی۔ تمام الفاظ کو چھوڑ کر ایک لفظ مبہم "ما" اختیار کیا گیا دو حرفی جس سے زیادہ مختصر لفظ غیر ممکن ہے کیونکہ حرف واحد بھی ہو تو مقام تلفظ میں دو حرفی بن جائیگا مگر اس مختصر ترین لفظ نے معنی کے اندر وسعت پیدا کر دی۔ اب معیار صلاح بھی اسی سے معلوم ہوا اور معیار افساد بھی "خدا کسی چیز کو جو ایک قوم میں ہو نہیں بدلتا

کیا ایسی جدو جہد اصلاحی کوشش اور تعمیر کہی جا سکتی ہے؟

یاد رکھنا چاہیئے کہ تخریب آسان ہے اور تعمیر بہت دشوار۔ فساد سہل ہے اور اصلاح مشکل۔

اصلاح کی ضرورت محسوس ہو تو اس طرح اصلاح کیجیے کہ موجودہ عمارت قائم رہے اور اس میں جو نقائص ہیں وہ رفتہ رفتہ دور ہو جائیں نہ ایسی اصلاح کہ موجودہ عمارت بھی پیوند زمین ہو جائے اور دوسری عمارت کا خواب ممنون تعبیر نہ ہو۔

بہرحال تعمیر اور تخریب کا معیار یہ ہے کہ موازنہ کیجیے پہلی حالت میں اور جدید حالت میں۔ اگر سابقہ صورت میں کچھ نقائص ہیں تو ضرور انھیں دور کرنے کی کوشش کیجیے لیکن اُن عام قوانین میں جو تمام نوع انسانی سے متعلق ہیں یہ سمجھنا کہ موجودہ قانون ضروریات زندگی کے لئے پورے طور پر مطابق ہے یا نہیں موقوف ہے اس بات پر کہ انسان اُس شئے کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہو۔ ضروریات زندگی کا پورا مطالعہ کر چکا ہو اور یہ ضروریات زندگی شخصی نہیں کسی خاندان سے مخصوص نہیں کسی حلقہ سے مخصوص نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کے ضروریات زندگی، اس لئے ایک مصلح کی ضرورت ہے جو نوع انسانی کے ضروریات کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ تمام مختلف طبائع امزجہ اور حالات پر ایسا عبور رکھتا ہو کہ متوازن قانون ایسا قائم کر سکے جو سب کے لئے ہر حیثیت سے مفید ثابت ہو۔ اگر بغیر اس صورت کے کسی عمارت کو صرف اعتراضات کی بنا پر خراب کرنے کی کوشش کی گئی تو مجھے اسے اصلاح ماننے میں عذر ہے بلکہ یہ

نہر لاکھوں کا ہونا تھا لہذا اب بھی ہو۔ گنگنا بند تھا تھا لہذا اب بھی ضرور بند ہے۔ شادی میں ہنڈیاں نہتی تھیں لہذا ضرور بنیں، چوتھی میں مصنوعی جنگ ہوتی تھی لہذا اب بھی ضرور ہو نہیں ہرگز نہیں اگر ہماری زندگی کے لئے یہ رسوم سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں تو فنا ہونے کے قابل ہیں اس عمارت کو یقیناً تباہ ہونا چاہیے اور اسکے بجائے نئی عمارت[1] کھڑے ہونیکی ضرورت ہے یہ کہنا کہ ان باتوں کو ترک کیسے کریں یہ تو بزرگوں کے وقت سے چلی آ رہی ہیں ویسا ہی ہے جیسے مشرکین کہتے تھے انا وجدنا آباءنا علی امۃ وانا علی آثارھم مقتدون "ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر چلتے دیکھا ہے .... ہم بھی اسی راستے پر چلے جائینگے" اگر باپ دادا کے طریقہ کار ہی پر چلنا ذریعہ نجات ہوتا تو انبیاء و مرسلین کے آنے کی ضرورت کیا تھی کیونکہ بہرحال دنیا میں بہت سی رسمیں قائم ہوتی ہی ہیں اور جو رسم قائم ہو جائے اُس کا برقرار رہنا ضروری ہے تو پھر نبی آکر کیا کریگا؟ نبی آئیگا تو تبدیل کریگا یا نہیں۔ اگر اس نے تبدیلی کی اور پرانے رسوم مٹ گئے

---

[1] لا تفسدوا فی الارض اس کا محل ہرگز نہیں ہے کہ میں اس میں زندگی کے مختلف شعبوں میں جن اصلاحات کی ضرورت ہے اُن کو تفصیل سے بیان کروں۔ بہرحال میں ہر سال اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہتا رہتا ہوں۔ "اسوہ حسینی" اور "اسلام کی حکیمانہ زندگی" میں میں نے اکثر ایسے مسائل کا تذکرہ کیا ہے اور "تجارت اور اسلام" بھی اسی سلسلہ کا ایک جز و ہے اور شیش محل میں ایک مستقل موعظہ اصلاح رسوم کے متعلق ہو چکا ہے اور رسوم عزا کے متعلق بعض تجاویز تین متحد المفاد مختلف اندازکے مضامین میں سال پیوستہ "اسد" اور "سرفراز" اور "نظارہ" کے محرم نمبروں میں لکھ چکا ہوں جس کا خلاصہ ہینڈبل کی صورت میں وارثین صاحب گوپی بندگی نے چھپوا کر سال گذشتہ مجلس میں تقسیم بھی کیا۔ (ارشادات حضرت سید العلماء مندرجہ سرفراز لکھنؤ ۹ صفر ۱۳۵۶ھ)

جبتک وہ اُس شے کو جو اُنکے نفوس میں ہے نہ بدلیں" اب اگر کسی قوم کی حالت بہتر سے بدتر ہوگئی تو سمجھنا چاہیئے کہ خرابی نتیجہ تغیر تھی اور اگر کسی قوم کی حالت بد سے بہتر ہوجائے تو سمجھے کہ یہ اصلاح نتیجہ تغیر

اب کیا ہوا؟ قدامت پسند حق پر رہے یا تجدد پرور حق پر؟ نہیں کوئی بھی نہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ نہ قدیم صرف قدیم ہونے کی بنا پر باقی رکھنے کے قابل ہے اور نہ جدید صرف جدید ہونے کی بنا پر چھوڑنے کا مستحق ہے۔ بلکہ قدیم کو دیکھنا چاہیئے اُس کے مفاد کے اعتبار سے اور جدید کو دیکھنا چاہیئے اُسکے مصالح کے اعتبار سے اگر قدیم نظام انسانی کیلئے زیادہ مناسب ہے تو اسکے بدلنے کی کوشش تخریب کی مرادف ہوگی اور اگر جدید زیادہ مناسب ہے تو اُسکا اختیار کرنا اصلاح ہوگا اور اس اصلاح میں سدراہ ہونا فساد۔

اسی نظریہ کو حدیث نے بایں الفاظ پیش کیا ہے "من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجر من عمل بہا الی یوم القیامۃ ومن سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزر من عمل بہا الی یوم القیامۃ" جو شخص کوئی طریقہ قائم کرے اچھا اُس کو ثواب ملیگا اُن تمام لوگوں کا جو اُس طریقہ پر عمل کریں قیامت کے دن تک اور جو شخص کوئی طریقہ قائم کرے برا اس پر گناہ لکھا جائیگا تمام اُن لوگوں کا جو اُس طریقہ پر چلیں قیامت تک"

ظاہر ہے کہ طریقہ قائم کرنا بغیر "تجدد" نہیں ہو سکتا لیکن یہی تجدد ایک جگہ ثواب لکھے جانیکا باعث ہے اور ایک جگہ گناہ کا تفرقہ کیا ہے "حسنہ" اور "سیئہ" ہونیکا یعنی ایک جگہ وہ طریقہ مفید تھا اس لئے وہ اصلاحی شکل رکھتا تھا اور دوسری جگہ مضر اس لئے "فساد فی الارض" کا مصداق تھا اس لئے خیال بالکل غلط ہے کہ جو کچھ زمانہ قدیم سے ہوتا چلا آیا ہے اُسکو قائم ہی رہنا چاہیئے

تغیرات پیدا ہوں۔ عالم انسانی کے حالات میں ہزاروں انقلابات ہوں لیکن اُن کلیوں کے ذریعہ سے ایک بالغ نظر انسان صورت حال کے مطابق رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔

اسی لئے ضرورت ہے کہ شریعت اسلام کے سمجھنے والے ہر زمانہ میں موجود رہیں اُس کے صحیح معانی کو اخذ کرنے والے اُس کے دلائل سے صحیح نتائج مرتب کرنیوالے اور حالات زمانہ کو دیکھکر احکام شرعیہ کی صحیح تشخیص کرنے والے۔

ضروریات زمانہ میں برابر انقلابات ہوتے ہیں اور شریعت کے احکام میں بھی باعتبار اشخاص۔ حالات۔ مقامات تبدیلیاں ہوتی ہیں لیکن یہ تمام تبدیلیاں تمام اختلافات۔ تمام تغیرات اسی ایک وسیع فضا کے اندر ہیں جسے شریعت نے اپنے حدود میں قائم کر رکھا ہے گویا شریعت اسلامیہ ایک عظیم الشان احاطہ ہے جس کے اندر ہزاروں تغیرات رونما ہو سکتے ہیں لیکن وہ احاطہ نہیں بدلتا۔ بے شک اس کیلئے سمجھنے کی ضرورت ہے، اس کیلئے ضرورت ہے کہ انسان اُن کلیات سے نتائج مرتب کر سکے اُن کلیات سے احکام کو اخذ کر سکے۔

یہی معنی ہیں شریعت اسلام کے مکمل ہونے کے اور یہی راز ہے اسکے خاتم شرائع ہونے کا جس کی بنا پر وہ ناقابل ترمیم و تبدیل ہے۔

ہم نے دیکھا ہے سابق زمانہ کی شریعتوں میں مگر کوئی سو برس تک قائم رہی۔ کوئی دو سو برس تک۔ کوئی تین سو برس تک۔ تو کیا اتنے طویل زمانوں تک حالات

تو اصلاح ہوگی۔ آپ کا نظریہ یہ ہے کہ جو ہوتا چلا آیا ہے وہ خوب ہے، تو اب نبیوں کا آنا فضول ہے۔

سابقہ انبیاء کے آنے کا مقصد اُن ذہنی و عملی تقلیدات و رسوم کا مٹانا ہے جو قوموں میں غلط صورت پر قائم ہو جاتے ہیں لیکن آپ کے نبی کی شریعت اتنی مکمل ہے کہ اس کے لئے اب کسی نبی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسی کی تعلیم جسے آپ بھول گئے ہیں اُسی کو یاد دلا دینا آپ کی زندگی کے از سر نو تعمیر کرنے کے لئے کافی ہے۔

بیشک میں نے کہا کہ ضرورت تجدید ہر زمانہ میں ہے اور تجدید جب تک نہ ہو تب تک اصلاح نہیں ہو سکتی اور اصلاح جہاں ضروری ہے تجدید بہرحال ضروری ہے۔

شریعت اسلام کا مکمل ہونا، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارے ضروریات زندگی جس رفتار پر جا رہے ہیں اُس میں کوئی تبدیلی نہ ہونا چاہیئے۔

یعنی بعثت رسولؐ کے پہلے العالم متغیر کا نظریہ ٹھیک تھا اور بعثت حضرتؐ کے بعد غلط ہو گیا۔ آپ کے وجود سے پہلے دنیا بے ثبات تھی اور آپ کے بعد دنیا باثبات ہو گئی۔ آپ کی بعثت کے پہلے عالم ایک نظام پر نہیں قائم تھا لیکن آپ کے بعد دنیا ایک نظام پر بغیر تبدل و تغیر جمود کے عالم میں چلی جا رہی ہے اس لئے شریعت مکمل ہے ایسا ہرگز نہیں ہے۔ عالم ہر حال میں متغیر ہے۔ دنیا کا نظام بہر صورت تغیر پذیر ہے اور تغیر ہر زمانہ میں تجدید کا مستلزم ہے لیکن شریعت اسلام کے مکمل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ شریعت اسلام میں ایسے وسیع کلیے ہیں کہ ضروریات زندگی میں لاکھ

موجب ہیں تو یہ امتداد شریعتوں میں کس اعتبار سے ؟

غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تغیرات کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ صورت حال میں تبدیلیاں سو برس میں بھی ہوتی ہیں اور دو سو برس میں بھی اور ہزار برس میں بھی لیکن یہ تفرقہ باعتبار حدود جامعیت کے پیدا ہوا یعنی وہ شریعت اپنے حدود میں ایسے کلیات رکھتی تھی جو سو برس کے ہونے والے حالات تک کو شامل ہو سکیں۔ وہ دوسری شریعت مثلاً ایسے کلیات رکھتی تھی جو دو سو برس تک کے تغیرات کو حاوی ہوں اور اس طرح تین سو برس اور چار سو برس تو اس صورت سے اگر کوئی ایسی شریعت ہو جس کے وسیع اور جامع کلیات انتہائے دور زمانہ تک رونما ہونے والے تمام امکانی تغیرات کو حاوی ہو سکیں تو یہ شریعت کیوں نہ دائمی حیثیت سے قائم رہے اور اسکے منسوخ کرنے کے لئے کسی نبی کی ضرورت کیوں پیش آئے ؟

سابقہ شریعتوں میں اس تفرقہ کا قائم کرنا ہی رمز تھا اس کا کہ جس طرح ان مختلف طولانی مدتوں کے لئے شریعتیں آسکتی ہیں اسلئے کہ انکی جامعیت میں تفرقہ ہو اسی طرح ایک ایسی شریعت بھی آسکتی ہو جو اپنی انتہائی جامعیت کی بدولت پھر منسوخ ہونے کے قابل نہو۔

یہ شریعت اسلام ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہے لن تجد لسنۃ اللّٰہ تبدیلا ولن تجد لسنۃ اللّٰہ تحویلا لیکن ہمارے ضروریات اور حالات بدلتے ہیں اور اسی کے اعتبار سے احکام بھی بدلتے ہیں جو بہر حال شریعت کے حدود کے اندر ہی

ایک صورت پر قائم رہتے تھے۔ یا ان سیکڑوں برس میں نظام زندگی میں کوئی تغیر پیدا نہ ہوتا تھا۔؟

دنیا کا نظام یہ بتلاتا ہے کہ وہ دس برس میں یکساں حالت پر نہیں قائم رہتی چہ جائیکہ سو برس اور دو سو برس اور تین سو برس۔ اتنی مدت میں انقلابات پیدا ہوتے ہیں، تغیرات رونما ہوتے ہیں پھر یہ کیا کہ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا نبی مختلف صدیوں کے بعد آتا رہا۔

اسکے علاوہ ہمارے رسول خاتم النبیین کے بعد ۱۲ سو برس تک مثلاً کوئی نبی مبعوث نہو اور اسکے ضرورت پیدا نہو۔ کیا وجہ کہ اس دوران میں کسی نبی کی ضرورت محسوس نہو۔ آخر اس زمانہ میں کوئی رسول کیوں نہ پیدا ہوا۔ کیا ضروریات زندگی سے خدا ناواقف ہے؟ کیا حالات زمانہ سے وہ بےخبر ہے؟ یا کیا باخبر ہونے کے باوجود اس نے تساہل سے کام لیا؟ کیا اس کی طبیعت میں کاہلی ہے کہ ضرورت کا احساس پہلے پیدا ہو اور کام بعد میں کرے؟ کیا اس کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ پہلے احساس پیدا کرے پھر سمجھے کہ اس کو کیا کرنا چاہیئے؟ اسکے لئے اسباب مہیا کرے انتظام کرے پھر ضرورت کا سر انجام کرے۔ نہیں جبکہ یہ کچھ بھی نہیں ہے تو ماننا پڑیگا کہ جس شریعت کی عمر جتنی تھی خواہ سو برس خواہ دو سو برس خواہ پانچسو برس بہر حال اس طویل مدت کے دوران میں کسی دوسرے صاحب شریعت نبی کے آنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ کیونکر تھا جبکہ اس دوران میں تغیرات ضرور ہوتے تھے اور تغیرات ہی نبی کی بعثت کے

لیکن اس تبدیلی کا اثر کیا شریعت پر پڑا؟ نہیں، شریعت میں تبدیلی نہیں ہوئی کیونکہ
یہ حکم تو جب سے شریعت قائم ہوئی ہے جب ہی سے تھا کہ انسان مسافرت کی حالت میں
دو رکعت نماز پڑھے اور یوں چار رکعت پڑھے۔ اتفاق سے اب تک یہ اس صنف
میں داخل تھا لہذا اس وقت یہ حکم تھا۔ اب یہ اس صنف میں داخل ہو گیا لہذا
وہ حکم ہو گیا۔ نہ شریعت میں تبدیلی ہوئی اور نہ شریعت کے حکم میں تبدیلی ہوئی۔
یوں ہی دوسرے مقامات ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ کبھی جزئیات کے ذریعہ حکم پیدا ہوتا ہے اور کبھی کلیات کے
ذریعہ۔ اگر کلیہ بحیثیت کلیہ کوئی چیز ہے تو اس سے نکلے ہوئے جزئی احکام اس
شریعت کے حدود سے خارج نہیں ہو سکتے اس لئے کہ کلیہ تو ہمیشہ جزئیات کے وجود کا
رہین منت ہوتا ہے۔ اگر جزئیات سے قطع نظر کیجئے تو کلیہ کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا۔
کلیہ کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے ہمیشہ اُن خصوصیات میں عمل کرنے سے کہ جہاں وہ کلیہ منطبق
ہو۔ اب اگر ہم نے اس کے پہلے کسی خصوصی مصداق کو کلیہ کے نہیں سمجھا تھا یا ہم کو
ضرورت نہ ہوئی تھی اور پھر ضرورت پڑی اور ہم نے کسی خصوصی حکم کا استنباط کیا تو وہ
ہمارے لئے ایک نئی چیز تو ہوگی لیکن چونکہ وہ حکم شرعی کے تحت میں ہے لہذا درحقیقت
نئی نہیں ہے۔

میں آپ کے سامنے مثال پیش کروں۔ بہت سے اشخاص کہیں گے کہ بالکل
نئی چیز ہے جو ہم نے نہیں سنی۔

ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے ایک شخص ہے اُس نے عمر میں کبھی سفر نہیں کیا۔ اپنے وطن میں
پیدا ہوا، وطن میں آنکھیں کھولیں، وطن میں پرورش پائی اور پچاس سال کی عمر تک
وطن ہی میں رہا۔ اس لئے ہمیشہ پانچوں وقت پوری نماز پڑھی ماہ صیام میں ہمیشہ
روزے رکھے۔ اتفاق کی بات پچاس برس کی عمر کے بعد اب اُس کو سفر پیش آیا۔ دوران
سفر میں وہ اسی طرح نماز پڑھنے لگا جس طرح پڑھتا تھا یعنی صبح کی دو رکعت۔ ظہر
عصر کی چار چار رکعت مغرب عشا کی تین اور چار رکعت۔ بدقسمتی سے ایک واقف
شریعت موجود تھا۔ اُس نے پوچھا تم نے کے رکعت نماز پڑھی۔ اس نے کہا جتنی ہمیشہ
پڑھتا تھا۔ اُس نے کہا نہیں اب ظہرین اور عشا کی دو دو رکعت پڑھو۔ اُس نے کہا
دو رکعت کیسے پڑھوں؟ کیا شریعت میں تبدیلی ہوگئی ہے؟ شریعت تو ہمیشہ ایک
رہتی ہے۔ دو شریعتیں کیسے ہوگئیں۔ ہمارے لئے جو شریعت پیشتر تھی وہ ہی اب بھی ہے
اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ لہذا ہمارے لئے جو چار رکعت نماز پہلے تھی وہی
اب بھی ہونا چاہئیے لاکھ اوس کو سمجھایا جاتا ہے مگر وہ نہیں مانتا۔ کہتا ہے جو شریعت کا حکم
ہے اسی پر عمل کروں گا۔ حلال محمد حلال الیٰ یوم القیامۃ
وحرام محمد حرام الیٰ یوم القیامۃ۔

پھر حقیقت حال اس صورت میں کیا ہے؟ حکم میں تبدیلی ہوئی یا نہیں ہوئی
ضرور ہوئی یعنی روزانہ اسکے لئے لازم تھا کہ چار رکعت نماز پڑھے اور آج
دو رکعت نماز ہوگئی۔

حاصل کرنیکی کوشش کیجئے۔ پوری فہرست شوہر کے مظالم کی ہمارے سامنے بیان کر دی گئی۔ ہم نے اظہار ہمدردی کیا ٹھنڈی سانسیں لیں۔ اور افسوس کیا، اور پھر یہ کہا کہ دیکھئے کسی صورت سے طلاق حاصل کرنیکی کوشش کیجئے یہ ہرگز نہیں کہیں گے اور نہ کہہ سکتے ہیں کہ لڑکی خود طلاق لے لے۔ کیونکہ لیلئے آخر کوئی حق بھی تو ہو لیکن اگر آپ شرع کے کلیات پر غائر نظر ڈالتے تو آپکے لئے عملی طور پر ایسا حل معلوم ہو جاتا کہ شوہر پر بے اعتمادی کی صورت میں زوجہ کے لئے حق طلاق حاصل کیا جا سکے اور پھر شوہر کو اُس کے سلب کرنیکا اختیار نہ ہو۔ یہ صورت نئی ضرور ہوگی مگر چونکہ وہ شرع کے تعلیمات ہی سے ماخوذ ہے اسلئے نہ وہ شریعت کے دوام وبقا کے خلاف ہے نہ اُس کی جامعیت کے منافی۔

یہ اور بات ہے کہ گزشتہ واقع شدہ نکاحوں میں ہم اُس شریعت کے حل سے فائدہ نہ اٹھا سکیں لیکن یہ ہماری ناواقفیت ہے اور ہماری غفلت۔ اگر موقع عقد پر زوجہ وکیل طلاق ہو جائے شوہر کی طرف سے اُن حالات میں کہ جب طلاق کی ضرورت ہو اور یہ وکالت اصل صیغۂ عقد میں داخل کر دیجائے خواہ اسی عقد نکاح میں یا کسی دوسرے عقد لازم میں تو اب جسوقت اس قسم کے حالات رونما ہوں زوجہ کو حق ہوگا کہ وہ شوہر کی طرف سے خود یا جس کیلئے وکالت طلاق حاصل ہوئی ہو اُس کے ذریعے سے طلاق واقع کرا دے۔

وکالت بجائے خود قابل فسوخی چیز ہے لیکن جبکہ وہ عقد لازم کے ضمن میں ہوگی تو اسکا منسوخ کرنا بھی شوہر کو ممکن نہ ہوگا۔ یہ صورت کیا شریعت اسلام کے اصول مقررہ کے خلاف ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ طلاق دینے والا درحقیقت موکل ہی ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ زوجہ کو حق

شریعت میں عام طور پر یہ حکم ہے کہ طلاق کا اختیار شوہر کو ہو۔ یہ حکیمانہ مصالح پر مبنی ہے اور اس وقت محل نہیں ہے کہ اس کی تشریح کی جائے بہر حال اس میں کلام نہیں ہے کہ طلاق کا حق زوجہ کو نہیں ہے بعض لوگ غلط فہمی سے سمجھتے ہیں کہ خلع میں طلاق زوجہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ خلع میں بھی طلاق دینے والا مرد ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ خواہش اسکی عورت کی طرف سے ہو اور معاوضہ کے ذریعہ مرد کو اس پر آمادہ کیا جائے۔

پھر کیا ایسی صورت بھی ہے کہ طلاق کا حق زوجہ کے اختیار میں آجائے آپ فرمائینگے نہیں بہت اچھا نہیں لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوتے ہیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زوجہ طاعت گذار اور شوہر ایذا رساں۔ وہ نان و نفقہ نہیں دیتا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ خبر گیری نہیں کرتا جب اس سے طلاق کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ فقط ستانے کے لئے اور پریشان کرنے کے لئے طلاق نہیں دیتا۔ اس کا سبب کبھی یہ ہوتا ہے کہ طلاق کو معیوب سمجھ لیا گیا ہے لیکن درحقیقت معیوب تو وہ حالات ہیں جن کا نتیجہ طلاق ہوتا ہے اور اس لئے کہا گیا ہے ابغض الحلال عند اللہ الطلاق لیکن عام طرز معاشرت میں ان حالات کو معیوب نہیں سمجھتے۔ مگر طلاق کو معیوب سمجھتے ہیں اس لئے طلاق نہیں دیتے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے لڑکی کے لئے کوئی طریقہ چھٹکارے کا نہیں قرار دیا کیا اچھا ہوتا کہ ان صورتوں میں یہ لڑکی بجائے طلاق لیکر آرام کی زندگی بسر کرتی۔ ہم سے اگر پوچھئے تو ہم بھی کہیں گے کہ طلاق

ایران میں بھی ہوئے ہیں۔

مگر یہاں مشکل تو یہ ہو کہ نکاح کے وقت میں طلاق کا نام آیا اور بدشگونی پیدا ہو گئی حالانکہ اسلام میں بدشگونی کوئی چیز نہیں ہی۔ یہ آپکی زندگی دوسرے اقوام کیساتھ مخلوط ہو کر بدشگونی میں گھر گئی ہی۔ ورنہ آپکا اسلام بدشگونی کی تعلیم نہیں دیتا یہ جہالت کے اقوال تھے کہ حضرت موسیٰ سے کہا جاتا تھا انا تطیرنا بک "تم کو ہم بدشگون سمجھتے ہیں"۔

اسلام میں تفاؤل" ہی جس کے معنی ہیں شگونِ نیک حاصل کرنا، زندگی کے اقدامات میں سکون و اطمینان پیدا کرتا ہی۔ بدشگونی نہیں ہی جو حیاتِ انسانی کے سکون میں اضطراب و تشویش پیدا کری بہرحال جب شوہر کی بے اعتدالیوں کا اندیشہ ہو تو اس کا یہ حل موجود ہی۔ اگر غلطی سے ابتک اس صورت کو نہیں اختیار کیا گیا تو یہ اپنی غلطی تھی۔ اس سے اسلام کی جامعیت پر حرف کیوں لایا جائے شریعت اسلامیہ کے اندر یقیناً ہزاروں انقلابات کیساتھ چلنے کی صلاحیت ہے ہمارے حالات زندگی میں لاکھوں تغیرات و اصلاحات ہو سکتے ہیں۔ ہزاروں تجدیدیں پیدا ہو سکتی ہیں جو شریعت کے حدود میں ہوں اور اس سے خارج نہوں۔

پھر تجدید کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شریعت کے خلاف ہے جس طرح قدامت کی ہر رسم ضروری نہیں کہ مفادِ عام کے خلاف ہی ہو، اس لئے ضروری ہی کہ قدیم و جدید میں موازنہ کر لیا جائے۔ اس کے بعد جو قدم اٹھایا جائے وہ اصلاحی قدم ہوگا ورنہ تخریب قرار پائیگا اور "فساد فی الارض" کا مصداق۔

طلاق حاصل ہو لیا ہو۔ طلاق اسی کی جانب سے عمل میں آیا جسے شرع نے طلاق کا اختیار دیا ہو۔ رہگئی وکالت تو ظاہر ہے کہ شوہر ایک اجنبی انسان کو وکیل طلاق بنا دیتا ہو تو وہ صیغۂ طلاق کا اجرا کر لیتا ہے یا نہیں پھر اگر زوجہ بحیثیت وکیل اس صیغۂ طلاق کا اجرا کرے تو کیا ہوا؟ صورت مذکورہ بالکل اصول شریعت کے مطابق ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اب تک اس پر عملدرآمد نہیں رہا اگر اب ضرورت محسوس ہو تو اس کا اجرا کیا جا سکتا ہو۔[۱]

بہر حال یہ نہ کہئے کہ شریعت اسلامیہ ناقص ہو۔ ہرگز نہیں وہ کامل ہو اس میں ضروریات زندگی کے لحاظ سے احکام موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی ناواقفیت کی وجہ سے بعض احکام سے فائدہ نہ اٹھائیں یا یہ کہ کسی حکم خاص پر عمل کرنے کی اب تک ضرورت محسوس نہ ہوئی ہو اب اگر ضرورت محسوس ہو تو اس پر عمل ہو سکتا ہے عراق میں ایسے عقد ہوتے ہیں

---

[۱] یہ اندیشہ کہ کہیں عورتیں اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں اور جو درماں تجویز کیا جا رہا ہو وہ مستقل آزار نہ بن جائے اس کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہو کہ جب حق وکالت عطا کرنا مردوں کے اختیار سے تعلق رکھتا ہو تو کیوں وہ حق وکالت مطلق طریقہ پر عطا کریں بلکہ اس صورت سے مشروط وکالت عطا کریں کہ اگر مثلاً وہ ایک طویل معینہ مدت تک غائب ہو جائیں یا اتنی مدت تک نان ونفقہ ادا نہ کریں تو زوجہ وکیل طلاق ہوگی اس صورت میں زوجہ کو مطلقاً حق طلاق نہ ہوگا اور جو درماں تجویز کیا جا رہا ہے وہ درماں ہی رہیگا مستقل آزار نہ بن سکے گا نیز جبکہ اس حق کا ادا کیا جانا مرد کے عقل وتدبر اور اختیار کے ماتحت ہو تو وہ اس مفاد صنفی کے خلاف بھی نہ ہوگا جس کے لحاظ سے شارع نے یہ حق مرد کے لئے قرار دیا ہو۔ (ارشادات حضرت سید العلماء مندرجہ سرفراز لکھنؤ ۹ صفر ۱۳۵۶ھ)

ومن النّاس من یعجبک قولہ فی الحیوٰۃ الدنیا ویشہد اللہ علی مافی قلبہٖ وھو الدّ الخصام ۝ واذا تولّٰی سعٰی فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل و اللہ لا یحب الفساد ۝ واذا قیل لہ اتّق اللہ اخذتہ العزّۃ بالاثم فحسبہ جہنّم ولبئس المہاد ۔

(یعنی) کچھ لوگ ایسے بھی ہیں دنیا میں جن کی باتیں اس زندگی کے دور میں تم کو بہت خوشنما معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنے حسن نیت اور ضمیر کی سچائی پر خدا کو گواہ بھی کرتے رہتے ہیں حالانکہ وہ سخت ترین بدخواہ، نوع انسانی کے دشمن ہیں۔ انھوں نے ادھر تمھاری طرف سے منہ موڑا اور بس کوشش شروع کر دی کہ زمین میں فساد پیدا ہو اور مالی و جانی نقصانات ہوں اور خدا فساد کو پسند نہیں کرتا جب ایسے شخص سے کہا جاتا ہے کہ خدا کا خوف کرو تو اُسے اپنے گناہ پر (شرم کے بجائے) انانیت دامنگیر ہوتی ہے لہذا اسکے لئے بس جہنم کافی ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے"۔

بے شک مفسدین کا طرز عمل یہی ہے۔ دل میں فساد کے ارادے اور زبان سے صلاح کے دعاوی۔ بدخواہی خلق کی نیتیں اور ہمدردی و خیرخواہی کے اظہارات۔ اب چونکہ نیت کا معاملہ ہے اس لئے دنیا کے اندر اس عمل کی پردہ دری مشکل ہے دنیا میں اس گناہ کا پردہ چاک ہونا دشوار ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ جہاں نیتوں کا حساب ہوگا وہاں سمجھ لیا جائیگا۔ دنیا جسمانی حیثیت سے خدا کے سامنے حاضر ہونے سے قاصر اور خدا کے لئے اُس کا جلال و جبروت اور کمال ذاتی اس دنیا کے سامنے آنے سے

مصلحینِ عالم پر "فساد فی الارض" کا الزام
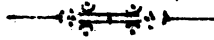
صلاح و فساد باعتبار ظاہری صورتوں کے تقریباً ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوئے طرز عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ وہ صورت عمل جو ایک مفسد کی ہوتی ہے وہی ایک مصلح کی۔ وہ بھی ایک عمارت کو خراب کرتا ہے۔ دوسری عمارت اُس کے بجائے قائم کرتا ہے یہ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔

اس بنا پر ذرا نگاہ کسی دعوت دینے والے کے طرز عمل کو دیکھکر اکثر اوقات دھوکا کھا جاتی ہے اور مفسد کو مصلح سمجھ لیتی ہے یا مصلح پر مفسد ہونیکا دھوکا ہوتا ہے اور کبھی انسانی دماغ تردد میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ہم اُس پکارنے والے کی آواز پر مصلح سمجھ کر لبیک کہیں یا مفسد سمجھ کر اُس سے کنارہ کشی کریں۔

مصلحین کی آواز کو مفسدین کی طرف سے ہمیشہ یہ کہکر دبانے کی کوشش کی گئی کہ یہ مفسد ہیں اور مفسدین اپنے مقصد کو ہمیشہ یہ کہکر پورا کرتے رہے کہ ہم مصلح ہیں۔ اس کے متعلق تصویر کا ایک رخ قرآنی آیت سے پہلے پیش ہو چکا ہے کہ مفسدین مصلح ہونے کے دعویدار بنتے ہیں اذا قیل لھم لاتفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون۔

دوسری جگہ اس تصویر کے خاکہ میں پورا رنگ بھرا گیا ہے اس طرح۔

گئے تھے مگر اس مصلح حقیقی پر الزام کیا عائد کیا جاتا ہے؟

وقال الملأ من قوم فرعون اتذر موسیٰ وقومہ لیفسدوا فی الارض ویذرک والھتک قال سنقتل ابناءھم ونستحیی نساءھم وانا فوقھم قاھرون (اعراف پ ۹)

"فرعون کی جماعت والوں نے کہا فرعون سے کہ کیا تم موسیٰ اور انکی قوم کو چھوڑ دو گے کہ وہ زمین میں فساد کریں اور تم کو اور تمھارے معبودوں سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ فرعون نے کہا۔ یہ کیا مشکل ہے۔ ہم انکے بچوں کو قتل کر ڈالیں گے اور اُن کی عورتوں کو زندہ قید کر لیں گے اور ہم لوگ تو اُن پر پورا قابو رکھتے ہیں۔"

ملاحظہ کیا آپنے؟ موسیٰ اور اُن کے متبعین پر فرعون والوں کی جانب سے کیا الزام عائد کیا گیا؟

(لیفسدوا فی الارض) زمین خدا میں فساد پیدا کرنا۔ اب اسکے خلاف وہ کہ جس نے موسیٰ کو اصلاح کا عہدہ تفویض کر کے بھیجا ہے وہ اس حقیقت کی پردہ کشائی کس طرح کرے؟ اگر وہ اسکے مقابلہ میں صاف یہ کہے کہ مفسد خود فرعون اور اسکی قوم ہی تو اس سے کیا ہوا۔ ایک طرف خدا اور ایک طرف فرعون۔ یہ اُسکے والوں کو کہہ رہا ہے مفسد۔ وہ اس کو اور اسکی جماعت والوں کو بتا رہا ہے مفسد۔ تو اس میں لطف کیا ہوا مگر چونکہ فرعون اور اُس کی قوم کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ موسیٰ اور اُن کی قوم مفسد اس لئے خدا نے تعریض کے پیرایہ میں جواب دیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

مانع اس لئے یہاں آسان پہ قدغن لگادیا جائے لیکن اس گواہی کی تصدیق کیونکر ہو۔ نتیجہ اس کا آخرت میں جو ظاہر ہونا ہے وہ ہوگا۔ یہاں جہنم ہی سہی لیکن یہاں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں تو بہت سے لوگوں کو دعوت اصلاح کے بہانے سے اپنے راستے پر لگا لیا اور دنیا کو اپنا گرویدہ بنا کر اپنا کام نکالا۔

اب دوسرا رخ کہ مصلحین پر مفسد ہونیکا الزام لگایا جاتا ہے۔ اسکے بھی نقشے آپ کو قرآن میں نظر آئینگے۔ کفّار کی جانب سے انبیاء و مرسلین پر یہی جرم عائد کیا جاتا تھا کہ یہ مفسدہ پرداز ہیں اسلئے ان کو فنا کرنا چاہیئے انکی آوازوں کو سننا نہ چاہئے جب کچھ کہنا چاہیں تو لوگ کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ یہ اہتمام کس بنا پر تھا اس لئے تھا کہ وہ انھیں مفسد قرار دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ باتیں خرابی پیدا کرنے والی ہیں اسلئے ان کو سنا ہی نہ جائے ان اشخاص کی آواز جہاں تک ممکن ہو دبا دی جائے اور ان کو اپنے دل کی بات زبان پہ لانے کا موقع ہی نہ دیا جائے خیال تو فرمائیے موسیٰ فرعون کی ہدایت کیلئے مبعوث ہوئے تھے! اور فرعون کی اتنی سرکشی، فساد فی الارض کا وہ درجہ جس کی نظیر تاریخ میں ملنا مشکل یعنی وہ مظالم جو فرعون کی طرف سے بنی اسرائیل پر کئے جاتے تھے اس دور تہذیب میں خیال میں نہیں آتے۔ عورتوں کے شکم چاک کرانا۔ بچوں کو مار ڈالنا۔ لڑکیوں کو اسیر کرنا۔ بنی اسرائیل کو اچھوت سمجھنا اور تمام حقوق انسانیت سے ان کو محروم کر دینا۔ کیا اس سے بڑھکر فساد فی الارض ہو سکتا ہے اور موسیٰ یقیناً مصلح بنا کر بھیجے

ما جئتم به السحر ان الله سیبطله ان الله لا یصلح عمل المفسدین۔

یہ نہیں کہا کہ کون مفسد ہے مگر یہاں برہان عقلی حقیقت معجزہ پر قائم کر دیا اور سحر کے باطل ہونے کو ظاہر کر دیا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ مفسد کون ہے۔

حقیقت معجزہ پر ضمنی بحث[ع][1]

دیکھنے میں سحر اور معجزہ دونوں ایک ہی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ وہاں بھی غیر معمولی باتوں کا دکھلانا ہے اور معجزہ بھی غیر معمولی صورتوں کا پیش کرنا ہے لیکن درحقیقت معجزہ اور ساحری میں فرق باعتبار روح، باعتبار حقیقت اور باعتبار جوہر ہے۔ ہیں دونوں غیر معمولی چیزیں لیکن ساحری کیسا تھ کوئی دعویٰ ایسا شریک نہیں ہوتا جس کی ذمہ داری خدا پر عائد ہوتی ہو اور اعجاز میں غیر معمولی مظاہروں کے علاوہ کوئی ایسا دعویٰ شریک ہوتا ہے۔

دنیا میں مختلف طرح کے کام ہوتے ہیں کچھ معمولی کچھ غیر معمولی خدا کو کیا لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ان کاموں میں ناکامی ہی پیدا کرتا رہے سحر بھی عالم اسباب

ع۔ دوران بیانات میں بعض تعلیمیافتہ اصحاب کی طرف سے اس مسئلہ پر کسی حد تک تبصرہ کرنے کی خواہش کی گئی تھی اسلئے یہ ضمنی بحث جو درحقیقت موضوع سے خارج ہے ایک معمولی مناسبت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ مسئلہ معجزہ ایک مستقل مبحث ہے ضمنی حیثیت سے روشنی ڈالنے میں اس کے تمام گوشے سیراب کہاں ہو سکتے ہیں۔ بہر حال میں اس موضوع پر تفسیر قرآن کے تمہیدی مقدمات میں جو رسالہ حقائق کے سال اول میں شایع ہوئے ہیں بہت کچھ لکھ چکا ہوں ممکن ہے جو گوشے یہاں رہ گئے ہیں یا نظر بحث آ چکے ہوں (ارشادات سید العلماء مندرجہ سرفراز ۹ صفر ۱۳۵۶ھ)

ثم بعثنا من بعدھم موسیٰ بآیاتنا الیٰ فرعون وملائہ فظلموا بہا فانظر کیف کان عاقبۃ المفسدین (اعراف پ۹)

ہم نے موسیٰ کو بھیجا اپنی نشانیوں کیساتھ فرعون اور اسکی جماعت کے پاس مگر اُن لوگوں نے ہماری نشانیوں کیساتھ ظلم کیا۔ اب تم خود دیکھ لو کہ مفسد جو تھے اُن کا انجام کیا ہوا"۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ گالی کے مقابلہ میں گالی دینا کوئی لطف کی بات نہیں لیکن حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے۔ خدا کو اپنے پیغمبر کو بری کرنا تھا اس پر مفسد ہونیکا جو الزام لگایا گیا تھا اس کا دفعیہ کرنا تھا جس کے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ ایک دوسرے موقع پر جب موسیٰ اور ساحران فرعون میں مقابلہ ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے:

فلما القوا قال موسیٰ ما جئتم بہ السحر ان اللہ سیبطلہ ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین۔ "جب ساحروں نے اپنی رسیاں پھینکیں موسیٰ نے کہا یہ جو تم نے ظاہر کیا یہ سحر ہے خدا اسے ابھی ابھی باطل کر دیگا۔ خدا کبھی مفسدین کے کام کو سرسبز نہیں بناتا"۔

معلوم ہوتا ہے وہ "مفسد" کی لفظ کھٹک رہی ہے جس کا استعمال موسیٰ کے بارے میں کیا گیا تھا اور مختلف طریقوں سے اُس کا جواب دیا جا رہا ہے۔

میں کہہ چکا اور پھر کہتا ہوں کہ کبھی اس میں لطف نہیں ہے کہ کوئی آپ کو ناگوار طبع کلمہ کوئی کہے تو آپ اُس کلمہ کو اُس کی طرف پلٹا دیجیے نہیں آپ سوقت سکوت کیجیے اور پھر دلیل و برہان سے ثابت کر دیجیے کہ اس کلمہ کا مصداق کون ہے؟

"مفسد" کی لفظ موسیٰ کی نسبت کہی گئی! اب برابر مختلف طریقوں سے بتلایا جا رہا ہے کہ مفسد کون تھا؟

اُس کاتب کو اپنے اس نتیجہ عمل پر کچھ بھروسا بھی ہو اور وہ دنیا کو دعوت بھی دے سکے
کہ اگر کوئی میرا مقابل ہو تو اسکے مثل بنا کر پیش کرے سعدی کو حق تھا اپنی
گلستاں پر ادعائے کمال کرنیکا۔ یاقوت مستعصمی کو حق تھا اپنے کتبوں پر دعوائے
بے مثالی کرنے کا میر انیس کو اپنے مرثیہ کے اوپر ادعائے بے نظیری کرنیکا مختلف
اس قسم کے کارنمایاں ہوتے ہیں اور اُن کی مثال دنیا میں پیش نہیں ہوتی لیکن کیا
ضرورت خدا کو کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے دعوے کو غلط ثابت کرے اسلئے کہ
بہرحال اگر نتیجہ کمال ہے تو اُس کے ایک مخلوق کا وہ طاقتیں جن سے یہ کمال ظاہر
ہوا اُسکی پیدا کی ہوئی ہیں۔ وہ قوتیں جو کارفرما ہیں وہ خالق کی دی ہوئی وہ اگر
کسی کو پیدا کرے جو اُس کے دعوے کمال کو باطل کردے تو پھر ضرورت ہے کہ اسکی مثالی
باطل کرنے کے لئے ایک دوسرا پیدا کیا جائے اور پھر اُسکے لئے تیسرا پھر یہ سلسلہ
ختم تو ہوہی گا کیونکہ دنیا کا نظام متناہی ہے غیر محدود نہیں ہے لہذا آخر میں جو ہوگا
اُس کا دعویٰ لاجواب ہی رہیگا۔

پھر خدا کو کیا ضرورت کہ وہ اس جھگڑے میں پڑے اور ہر ایک کے دعوے کو
باطل کرے۔ لہذا ہر زمانہ میں ایسی قابلیت کے اشخاص پیدا ہو سکتے ہیں جیسی
قابلیتیں اُن کے غیر میں مفقود ہیں۔

ایک شاعر ایسا شعر کہہ سکتا ہے جس کے مثل کوئی اور نہیں کہہ سکتا کاتب ایسا کتبہ
لکھ سکتا ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملسکتی۔

ماتحت ہے۔ دنیا میں بہت سے اسباب کارفرما ہیں۔ وہ سب اسباب خدا ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ان اسباب میں کچھ وہ ہیں جو ہم کو معلوم ہیں۔ کچھ ہم کو نہیں معلوم ہیں۔ جو ہم کو معلوم ہیں وہ ہمارے لئے معمولی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ اسباب جو خاص خاص لوگوں کو معلوم ہوتے ہیں وہ غیر معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر یہ نہیں ہے کہ کوئی اثر بغیر مؤثر رونما ہو جائے۔ سحر جو ہے وہ بھی عالم طبیعیات کے حدود کے اندر ہے۔ وہ بھی عالم کون و فساد اور نظام اسباب کے سلسلہ کے ماتحت ہے۔ اس لئے جب ہم کہتے ہیں کہ غیر معمولی چیز ہے یا خارق عادت ہے تو خارق اس بنا پر کہتے ہیں کہ وہ اس عام دستور کے خلاف ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے قائم ہے ورنہ اگر بلا اسباب ہوتا تو ہم خارق عادت نہ کہتے خارق عقل کہتے۔

اکثر عام اسباب کے سلسلہ میں نتائج ایسے غیر معمولی ہو جاتے ہیں جن کو دنیا بھی بیان کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

ایک طبیب بعض اوقات ایسے مریضوں کو اچھا کر دیتا ہے جن کا اچھا ہونا اس کے قبل دنیا نے نہیں دیکھا تھا۔ ایک انشا پرداز، بسا اوقات ایسی تحریر اس کے قلم سے نکل جاتی ہے جس کی نظیر اس سے پہلے آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔ ایک شاعر، بسا اوقات اسکی طبیعت سے ایسا شعر نکلجاتا ہے جیسا شعر اسکے قبل نہیں ہوا۔ ایک کاتب بسا اوقات اسکے ہاتھ سے ایسے نقوش نکلجاتے ہیں جس کے مثل کتبہ پہلے آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس طبیب کو۔ اس انشا پرداز کو۔ اس شاعر کو۔

چھاپہ خانہ کے وجود کی دلیل ہے۔ ہاں وہ اجزا جن کے ذریعے سے چھپا یہ وہ طاقتیں جو اس میں کارفرما ہوئیں وہ دلیل ہیں وجود خدا کی کیونکہ ان پر غیر خدا قادر نہیں ہے معلوم ہوا کہ وہ آثار جن پر وہ مخصوص حیثیت سے قدرت نہیں رکھتا بلکہ دنیا کے لوگ بھی اقتدار رکھتے ہیں وہ آثار دلیل وجود خدا کی نہیں بن سکتے۔

بافہم تعلیمیافتہ طبقہ سے کہتا ہوں۔ میرے ان الفاظ پر پھر غور کیجئے کہ خدا کے وجود کو کیونکر پہچانا؟ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک مادی تو خدا کو مانتا ہی نہیں کیونکہ وہ جو خدا کو نہیں مانتا اس سے میں معجزہ کی بحث کروں گا کیوں؟ معجزہ کا سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ تو جب ہی کہ خدا کا وجود پہلے ثابت ہو چکا ہو۔ چنانچہ بحث معجزہ کی ہے اس لئے میں خدا کے وجود کو اس طرح سے بتلا رہا ہوں گویا وہ تسلیم شدہ ہے۔ اُن مادی سے میں گفتگو کروں گا خدا کے وجود میں۔ معجزہ کی بحث میں بہرحال اس سوال کی گنجائش نہیں ہے۔ خدا تو تسلیم ہو ہی چکا، اسلئے یہ پوچھتا ہوں کہ خدا کو کیونکر مانا؟ آثار کے ذریعے سے۔

آثار اگر وہ ہوتے جو خدا اور غیر خدا میں مشترکہ حیثیت رکھتے یعنی خدا بھی اُن آثار پر قدرت رکھتا اور غیر خدا بھی تو یہ آثار کیسے دلیل ہوتے وجود خدا کی؟ نہ ہوتے۔ تو خدا کے وجود کی دلیل وہ آثار بن سکتے ہیں جو خصوصیت رکھتے ہوں خدا کے ساتھ یعنی جن پر غیر خدا قادر نہیں ہے۔

اب مجھے پہچاننا ہے خدا کے پیغمبر، خدا کی طرف کے سفیر کو۔ جب خدا کو خود اُسے

یہ سب ٹھیک ہے اسلئے کہ اس کے ساتھ کوئی دعویٰ شریک نہیں ہے جو خدا پر ذمہ داری عائد کرے لہذا خدا پر فرض نہیں ہے لیکن یاد رکھئے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک اپنے نتیجہ کارگذاری کو یہ کہکر پیش کرے کہ خدا نے مجھے کسی عہدہ پہ مقرر کرکے بھیجا ہے اور یہ اس کا ثبوت ہے۔ اور یہ جھوٹا ہو تو خدا پر لازم ہے کہ وہ کسی کو اتنی قوت عطا کردے جو اسکے خلاف مظاہرہ کرکے اس کے دعوے کو باطل کرے، ورنہ ان دیکھا خدا جو بغیر اپنے آثار قدرت کے خود نہ پہچانا جا سکا اس کے سفیر کو ہم بغیر آثار کے کیسے پہچانیں؟

جب خدا کی الوہیت آثار کی محتاج ہے۔ الوہیت محتاج نہیں ہوتی یعنی ہمارا پہچاننا اس الوہیت کو محتاج ہے آثار کی جانب۔ وہ خدا آنکھوں سے دیکھنے کے لائق نہیں ہے تو اب اس کی طرف سے سفارت کا عہدہ کیونکر تسلیم کیا جائے اگر کسی مادی ہستی کی طرف سے سفارت کا دعویٰ ہوتا اسکے پاس جاکر اسکو خط لکھکر تصدیق کرائی جا سکتی تھی کہ ہاں یہ میرا نمایندہ ہے لیکن یہاں تو ایسا نہیں ہے۔ جب خدا کی الوہیت کو خود اسے دیکھکر نہیں جانا تو رسول کی رسالت اس سے براہ راست دریافت کرکے تو جانی نہیں جا سکتی۔ پھر خدا کو کیونکر پہچانا؟ آثار کے ذریعہ سے۔ اب اگر یہ آثار مشترک حیثیت رکھتے یعنی غیر خدا بھی ان پر قادر ہوتا تو کیا یہ دلیل الوہیت بن سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔

چھپی ہوئی کتاب اپنے چھپے ہونے کی حیثیت سے خدا کے وجود کی نہیں بلکہ

کہ وہ حقائق پر غور کرسکیں اُن کے لئے ان مادی معجزوں کی کیا ضرورت ؟

میں کہتا ہوں کہ آپ سے کس نے کہا کہ معجزہ بس پتھروں کے بولنے ، ماہتاب کے شق ہونے ، یا آفتاب کے پلٹنے ہی سے متعلق ہے ۔ دیکھئے میرے الفاظ جو میں نے کہے ۔ وہ آثار خصوصی جو ایک مبعوث من اللہ کے لئے ہوسکتے ہیں اور دوسرے میں عقلا پائے نہیں جاسکتے وہ معجزہ ہیں وہ باعتبار معیار فہم مختلف ہیں ۔

وہ ایک بلند مرتبہ فلاسفر کے لئے وہ رموز و اسرار عقلی ہونگے جو اُس کے کلام میں ودلیعت ہیں ۔ اُس کے اعتبار سے وہی معجزہ ہونگے ۔

ایک سطحی نظر والے انسان کے لئے جو حقائق کلام کو نہیں سمجھ سکتا معجزہ ہے آفتاب کا پلٹنا اور ماہتاب کا دو ٹکڑے ہونا وغیرہ وغیرہ ۔

تو یہ نہ کہئے کہ معجزہ کی ضرورت نہیں ۔ معجزہ اگر نہ ہو تب تو نبی کی نبوت ثابت ہو ہی نہیں سکتی ۔ معجزہ کے معنی ہیں وہ چیز جس سے دوسرے لوگ قاصر رہوں ورنہ بس نبی قادر ہو سنگ ریزوں کا بولنا ۔ پتھروں کا کلام کرنا اس کو کبھی اسلام نے موقع استدلال میں پیش نہیں کیا ، بطور اعجاز اپنے لئے دلیل حقانیت نہیں قرار دیا ۔ یہ اور بات ہے کہ کسی خاص وقت کوئی جماعت یہی چاہتی ہو تو اُس کے لئے پیش کردیا ۔ کوئی خاص طبقہ ہو وہ یہ کہتا ہو کہ جبتک سنگریزے نہ بولیں گے ہم ایمان نہ لائینگے اُن کے لئے وہ ہوا ۔ کوئی ایسی جماعت ہو جو یہ کہتی ہو کہ اُس وقت تک ہم نہیں سمجھیں گے جبتک کہ چاند کے دو ٹکڑے نہ ہوں لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ ہمارے ایمان کا دارو مدار ان معجزات پر نہیں

دیکھکر نہیں پہچانا تو سفیر کی سفارت کو خود بھیجنے والے سے پوچھکر تو سمجھ نہیں سکتا
رہ گیا دعوی تو بہت سے دعویدار جھوٹے بھی ہوتے ہیں۔ کتنے مدعی رسالت آئے
کیا سب صحیح ہی کہتے تھے تو معلوم ہوا کہ مدعی کا دعوی اس باب میں کہ وہ خدا کی
طرف سے بھیجا ہوا ہے ضروری نہیں ہو کہ درست ہو۔ پھر جب بھیجنے والے تک ہماری
رسائی نہیں۔ بھیجے جانے والے کا دعوی مفید نہیں تو اب تبلائیے کہ کیونکر سمجھیں
خدا جس طرح غیر مادی تھا اُسی طرح یہ مادی انسان اُس رشتہ کے لحاظ سے جس کا غیر مادی
ہستی کے ساتھ ادعا کر رہا ہو مادی حدود سے بلند ہو گیا ہو۔ اسلئے ماننا پڑیگا کہ جس طرح
اُس غیر مادی ہستی کو پہچانا اُسی ذریعہ سے اُس غیر مادی ہستی کیساتھ تعلق کو پہچانیں
اُس کو ہم نے پہچانا تھا آثار کے ذریعہ سے۔ اس کو بھی آثار کے ذریعہ سے سمجھیں۔ ہاں
ہم نے کہا تھا کہ اگر آثار مشترکہ ہوتے جن پر خدا اور غیر خدا دونوں قدرت رکھتے ہیں
تو خالق کے وجود کی دلیل نہیں بن سکتے تھے۔ اسی طرح آثار جو اس عہدہ اور منصب
کی دلیل بن سکتے ہیں وہ وہی ہیں جو مخصوص ہوں۔

مخصوص کیا معنی؟ یعنی جو سوائے مبعوث من اللہ کے دوسرے شخص میں
عقلاً پائے نہ جاسکیں۔ اسی کو کہتے ہیں "معجزہ"۔

اکثر لوگوں اس معجزہ کے معنی صرف "مادی" کے سمجھ لئے ہیں۔ ماہتاب کا شق ہونا
معجزہ ہو۔ آفتاب کا پلٹنا معجزہ ہو سنگریزوں کا تسبیح کرنا معجزہ ہو۔ بس یہی معجزے
ہیں۔ اسلئے یہ جماعت اکثر کہتی ہو کہ جو لوگ اپنے عقول کے اعتبار سے اتنے ترقی یافتہ ہو

کے معجزات نبوت کا استدلال نہیں ہیش کیجئے کہیں نہیں ہی یہاں نبوت ایک دور اور زمانہ کیساتھ محدود نہیں تھی۔ اس لئے اُس کو ایسے معجزات کیساتھ وابستہ نہیں کیا جا سکتا تھا جو محدود حیثیت رکھتے ہوں۔ ایسی نبوت جو غیر محدود حیثیت رکھتی ہو اور غیر محدود ایسی کہ اُس میں مختلف طبائع مختلف طبقات اور مختلف خیالات کے افراد پیدا ہونے والے ہوں۔ عالم انسانی کے مراتب بلند ہونے والے ہوں اُس کے لئے معجزہ ایسا ہونا چاہئیے تھا جو ہر حیثیت سے معجزہ ہو۔ ظاہری اعتبار سے سطحی نظر رکھنے والوں کے لئے معجزہ۔ لفظ کے لحاظ سے اہل لفظ کے لئے معجزہ۔ معنی کے لحاظ سے اہل معنی کے لئے تحقیقی نظر رکھنے والوں کے لئے معجزہ۔ اہل سائنس کے لئے معجزہ۔ اہل حکمت کے لئے معجزہ۔ دنیا بھر کے لئے معجزہ۔

یہ قرآن ہی۔ یہ درحقیقت ایک معجزہ نہیں ہی رسول کا بلکہ جتنے لوگ دنیا میں ہیں اور جس طرح کے معجزہ کے طالب ہیں ہر ایک کے اعتبار سے اسی لحاظ سے معجزہ ہی۔ تو معجزہ کے معنی درحقیقت عام آنکھوں میں محدود ہو گئے ہیں۔ معجزہ کے معنی یہ سمجھ لئے گئے ہیں کہ مادی اشیاء میں انقلاب، یہی بس معجزہ ہی۔ اس لئے یہ کہتے ہیں کہ اس معجزہ کی ضرورت کیا ہی اُن لوگوں کے لئے جو مادی اشیاء کے تغیرات کو کچھ سمجھتے نہیں مگر درحقیقت معجزہ وہ نہیں ہی۔ معجزہ وہ دلیل ہی جو خصوصیت کے ساتھ کسی رسولؑ کی رسالت کو بتائے۔

اب اگر دلیل ایسی ہو جو روحانی حیثیت رکھتی ہو۔ جو علمی حیثیت رکھتی ہو تو وہ

یہی لئے میں کہتا ہوں کہ دنیا کی تمام نبوتیں وابستہ تھیں اُن معجزات کے ساتھ جو حدود زمانہ کیساتھ وابستہ تھے اور جو اُس زمانہ کیساتھ رخصت ہوگئے۔ میں نے مانا کہ عیسیٰ نے مردے زندہ کئے مگر جنھوں نے دیکھا ہوگا اُن کے لئے معجزہ ہونگے، میں نے تسلیم کیا کہ وہ مٹی کا پرند بناتے تھے اُن میں روح پھونکتے تھے اور وہ اُڑ جاتا تھا مگر یہ معجزہ انہی کے لئے تھا جو عین موقع پر موجود ہوتے تھے۔

میں نے مانا کہ یہ معجزات تھے مگر اُن کے لئے جن پر انکا اثر پڑ سکتا تھا جن کیلئے وہ حدود روایت میں آئے تھے اور قطعی تھے اُن کے لئے دلیل نبوت تھے مگر بعد والوں کے لئے تو وہ حدود روایت میں داخل ہوگئے۔ اور روایت کا یہ حال ہے کہ ہر پیشوا کی ماننے والی جماعت میں اس قسم کے روایات اپنے پیشوا کے متعلق موجود ہوتے ہیں تو پھر ان روایات میں کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ کون روایتیں غلط اور کون صحیح۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس عہد کے جانے کے ساتھ، اُن دیکھنے والوں کی نسل کے رخصت ہونے کے ساتھ معجزے رخصت ہوگئے۔ اب تو اُن کے لئے کوئی بھی دلیل نبوت موجود نہیں ہے۔

یعنی عیسائی یہودیوں سے تسلیم نہیں کرا سکتے کہ عیسیٰ کی نبوت حق تھی۔ ہم سے منوالیں گے کیونکہ ہمارے قرآن نے تصدیق کردی ہے مگر یہودیوں سے تسلیم کرالیں غیر ممکن اُن کے ساتھ کوئی دلیل نہیں ہے۔

اور ہمارے رسول کی نبوت، وہ اس طرح کے وقتی معجزات پر مبنی نہیں ہے۔ اسطرح

تمھاری رسیوں کا سانپ بن جانا وہ بھی حیرت انگیز اور میرے عصا کا اژدہا بننا یہ بھی حیرت انگیز مگر دیکھو ابھی یہ فیصلہ ہوا جاتا ہے کہ ان میں حق کون ہے اور باطل کون وہ معیار یہ ہے کہ جسے خدا برقرار رہنے دے وہ حق ہے اور جس کے اثر کو مٹا دے وہ باطل ہے۔ معلوم ہوگا کہ سحر ہی غلط دعوی کی اشاعت کرنیوالا مفسد ہے اور خدا مفسدین کی حمایت نہیں کرتا ۔

دیکھئے وہ الزام جو موسیٰ پر لگایا گیا تھا کہ یہ مفسد ہیں اس کا جواب آج دلیل و برہان کے ذریعہ سے دیا جا رہا ہے " تم نے ہم کو مفسد کہا اور اپنے دل کو خوش کر لیا لیکن آج دیکھو کہ کون مصلح اور کون مفسد ما جئتم بہ السحر ان اللہ سیبطلہ " یہ جو تم نے کرتب دکھائے ہیں یہ تو جادو ہے۔ ابھی ابھی خدا اس کو باطل کر دیگا " یہ اعتماد ہے حقانیت پر۔ اب یہ وہ کلیہ ہے جو آخر تک معیار اعجاز کو ثابت کرتا ہے اور مصلح و مفسد کے فرق کو نمایاں کر دیتا ہے۔ ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین یہ خدا مفسد لوگوں کے اعمال کو درست نہیں رہنے دیتا ۔

چونکہ تم میرے مقابلہ میں میرے اعجاز کو باطل کرنے آئے ہو اور میری کوشش پر پانی پھیرنے کے لئے ہو اگر میرا دعوی غلط ہو تب تو مفسد میں لیکن جبکہ میرا دعوی صحیح ہے اور میں مصلح ہوں تو تم جو میرے مقاصد میں سدراہ ہو حقیقی مفسد ہو۔ اب بھی تمھیں معلوم ہو جائیگا کہ میں مفسد ہوں یا تم۔ خدا اس مسئلہ کو حل کر دیگا کیونکہ وہ مفسدین کی حمایت نہیں کرتا۔

اس طرح موسیٰ نے برہانی طور پر مفسد ہونے کے الزام سے اپنی برأت ظاہر کی ۔

قدرت کو اپنے نمایندہ خاص (موسیٰ بن عمران) پر فساد فی الارض کا الزام اتنا

اس اعتبار سے معجزہ ہوگی معیار معجزہ کا کیا ہوتا ہے؟ میر انیس[1] کا کلام بےمثل سعدی کی گلستاں بےمثل یعقوب کے کتبے بےمثل۔ فردوسی کا شاہنامہ بےمثل ہر طرح کی چیزوں میں کچھ بےمثل نمونے موجود ہیں بےمثل کے معنی کیا یہی کہ کوئی دوسرا اسپر قادر نہوا مگر کیا یہ سب معجزے ہیں؟ نہیں کیونکہ بےمثال ہونے میں کوئی شبہہ سہی مگر ان کے ساتھ کوئی دعویٰ ایسا شریک نہیں جو انکی ذمہ داری خدا پر عائد کرے۔ یہی چیز یعنی میر انیس کا مرثیہ اگر اس دعویٰ کیساتھ پیش ہوتا کہ میں نبی ہوں اور یہ میری نبوت کی دلیل ہے تو ذمہ داری خدا پر عائد ہوجاتی۔ اب بھی اگر خدا اسکی بےمثال حیثیت قائم رہنے دیتا تو مجھے معجزہ تسلیم کرلینے میں عذر نہ تھا۔

اس لئے کہ اس صورت میں اگر وہ غلط گو ہو تو خدا پر حمایت باطل کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اور خدا کی ذات حمایت باطل سے بری ہے۔ بس یہی بات تھی جو موسیٰ نے ساحروں کے مقابلہ میں پیش کی تھی یہ کہکر کہ: ان اللہ سیبطلہ ان اللہ لایصلح عمل المفسدین میری اتنی طولانی تقریر اور اس میں میں نے جو کچھ کہا وہ سب ان دو جملوں میں مندرج ہے۔ موسیٰ کہہ رہے ہیں کہ دیکھو

---

[1] شاہنامہ وغیرہ اور قرآن کے متعلق مجھے اس کے طے کرنیکی ضرورت نہیں کہ یہ دونوں بلاغت میں مساوی ہیں یا نہیں کیونکہ اگر شاہنامہ کی حیثیت بلاغت خارق عادت درجہ پر تسلیم ہی نہ کیجائے تو کوئی سوال پیدا ہوتا ہی نہیں چونکہ اکثر تعلیم یافتہ طبقوں کی طرف سے قرآن مجید کے اعجاز کے مقابلہ میں شاہنامہ وغیرہ کو بطور مثال پیش کیا جاتا ہے اسلئے یہ کہا گیا کہ اگر ان کی شان بلاغت اس درجہ پر تسلیم کر بھی لیجائے تو وہ خصوصیت اعجاز پیدا نہیں ہوسکتی کیونکہ انکے ساتھ دعوائے نبوت شریک نہیں تاکہ خدا پر ذمہ داری عائد ہو (ارشادات سید العلماء مندرجہ سرفراز ۹ صفر ۱۳۵۶ھ)

ارشاد ہوتا ہے۔ ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناءھم ویستحیی نساءھم انہ کان من المفسدین
(سورۂ قصص پ ۲۰)

(یعنی) فرعون نے دنیا میں بلند ہونے کی کوشش کی اور اہل زمین میں تفرقہ اندازی کی۔ کچھ لوگوں کو کمزور سمجھ کر اُنکی اولاد کو ذبح کیا اور اُن کی عورتوں کو زندہ رکھکر کنیزی میں لیا۔ وہ یقیناً مفسدین میں داخل تھا۔"

یہ ایک منظر تھا اس صورت حال کا کہ مصلح حقیقی کو "مفسد" کا لقب دیا جائے اور اُس پر فساد فی الارض کا الزام عائد کیا جائے۔ اور ان صورتوں سے جن کا تذکرہ کیا گیا اس الزام کے دفعیہ کی ضرورت پیش آئے بس یونہی ہر دور میں سمجھ لیجئے کہ برابر مصلحین پر مفسد ہونے کا الزام لگایا گیا ہے اور اس کے ذریعہ سے مفسدین نے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی ہو۔

ذرائع اصلاح کا غلط استعمال
اور
"فساد فی الارض" کی مختلف صورتیں

دنیا میں مصلح اور مفسد کا تفرقہ اس لئے اور زیادہ دشوار ہو گیا کہ جو چیزیں

ناگوار گزرتا تھا کہ آخر تک اس لفظ کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور اس وقت بھی جب فرعون اپنے لشکر سمیت بنی اسرائیل کی مدد ہوا فرعون سے تخاطب کے موقع پر اسی لفظ کو صرف کیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔

وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتبعھم فرعون وجنودہ بغیا وعدوا حتیٰ اذا ادرکہ الغرق قال اٰمنت انہ لا الٰہ الا الذی اٰمنت بہ بنوا اسرائیل وانا من المسلمین ءالاٰن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین (سورہ یونس پ۱۱)

(یعنی) ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے عبور کرایا تو فرعون اور اسکے افواج نے ان کا پیچھا کیا یہاں تک کہ جب فرعون غرق ہونے لگا تو اس نے کہا کہ میں ایمان لا چکا ہوں کہ سوائے اسکے کوئی حقیقی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اسکے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں (جواب میں ارشاد ہوتا ہے) اب؟ حالانکہ اسکے قبل تو نافرمانی کرتا رہا اور "مفسدین" میں داخل رہا ۔

گویا آج حق و باطل کی جنگ کے سب سے آخری فیصلہ کن منظر میں بھی مشاہدہ ثابت کر دیا کہ موسیٰ پر مفسد ہونے کا الزام غلط تھا اور وہ لوگ جو ان پر یہ الزام عائد کرتے تھے خود بڑے مفسد تھے ۔

اس کے بعد اس وقت جب فرعون کا تذکرہ ہمارے رسول سے کیا گیا ہو اور اسکے اوصاف بیان کئے ہیں تب بھی اسکے مفسد ہونے کی صفت ضرور ذکر کی گئی ہے ۔

مذہب اور سلطنت کی اصلاحی طاقتیں

(اور)

فسادِ فی الارض میں اُن کا استعمال

حسین ابن علیؑ کی مصلح ہستی پر مفسدین کی جانب سے فسادِ فی الارض کا الزام

الزام کا دفعیہ اور حقیقتِ واقعہ کا کامیاب اظہار

سب سے بڑی طاقت عالم میں اصلاح عالم کی ذمہ داری مذہب کی طاقت ہے۔
"اسلام کی حکیمانہ زندگی" میں یہ بیان کسی حد تک تفصیل سے آچکا ہے کہ کیونکر
مفادِ عالم کیلئے مذہب کی ضرورت ہے۔ اس وقت تو اسے ایک مسلّم حقیقت کی حیثیت
سے دیکھنا چاہیئے کہ مذہب اصلاح عالم کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ جتنے خدمات مذہب نے
اصلاح عالم کے لئے انجام دئے ہیں اتنے کسی دوسری چیز نے انجام نہیں دئے لیکن اسی

دنیا میں اصلاح کی ذمہ دار ہیں اُن ہی کو مفسدین عالم فساد میں صرف کرتے رہے ہیں۔

دنیا میں اصلاح کی سب سے بڑی طاقت مذہب ہے مگر اسی مذہب کے نام کو اور اسکی ملمع کار صورت کو دنیا میں فساد کا ذریعہ بنایا گیا۔

دوسری طاقت اصلاح عالم کی حکومت و سلطنت ہے۔ یہ بھی نظام عالم کو درست ہی کرنے کے لئے ہے لیکن اسی سے دنیا میں عظیم فسادات برپا کئے گئے۔

تیسری چیز تمدن و تہذیب۔ اس کے ذریعہ سے اصلاح عالم ہونا چاہیئے اور موجودہ دور میں جبکہ مذہب کی طاقت گھٹ رہی ہو اور حکومت کی گرفت سے بھی لوگ آزاد ہونا چاہتے ہوں جس چیز کا نام اصلاح عالم کے سلسلہ میں لیا جا سکتا ہے وہ نظام تمدن و تہذیب ہی ہے لیکن اسی تہذیب و تمدن کی آڑ میں امن و امان عالم خاک میں ملایا گیا ہے اور اصلاح کے بجائے فساد پیدا کیا گیا ہے۔

میں ان تمام باتوں کو الگ الگ دکھاؤں گا اور ثابت کروں گا کہ ان میں سے ہر چیز کس طرح اصلاح عالم کی ذمہ دار تھی اور اُسے کس کس طرح "فساد فی الارض" میں صرف کیا گیا۔

ہزاروں گھر برباد ہو گئے۔ ہزاروں شہر ویران ہو گئے۔ ہزاروں مظلوم پامال ہو گئے صرف مذہب کی بنیاد پر۔

اور پھر دوسری طاقت جس کی اصلی بنیاد اصلاح پر ہے وہ سلطنت کی طاقت ہے حکومت اور سلطنت کی اصلی بنیاد اصلاح عالم پر قائم ہے لیکن چونکہ اس کے ذریعہ سے مادی طاقت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ طاقت مقاصد کے سرانجام پانے کی ذمہ دار ہوتی ہے اس لئے غلط مقاصد میں بھی اسی طاقت کو صرف کیا گیا اور اس سے بہت بڑے فسادات دنیا میں نمودار ہوئے اور مفاد عامہ کے خلاف اقدامات کئے گئے جن کا نتیجہ فساد فی الارض کی صورت میں رونما ہوا۔

یہ دو طاقتیں (مذہب اور سلطنت) ان میں سے ہر ایک تباہ کن اور ہر ایک نوع انسانی کے لئے غلط صورت میں استعمال کئے جانے کی شکل میں نہایت مہلک ہے اب اگر یہ دونوں طاقتیں کسی وقت میں یکجا ہو جائیں۔ مذہب کی طاقت کو سلطنت کی مادی قوت کیساتھ ایک مقام پر سمو کر کام لیا جائے تو پھر اس سے جو فسادات رونما ہو سکتے ہیں ان کی مثال دنیا کے پردہ پر دیکھی نہیں جا سکتی۔

مسیحی مذہب جو انجیل کے سطور میں محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو دوسرا رخسارہ بڑھا دو اس تعلیم میں جنگ و جدال، فتنہ و فساد کی گنجائش کہاں تھی لیکن اس مذہب کے علمبرداروں کو جب سلطنت کی سرپرستی حاصل ہوئی اور قسطنطین اعظم کے اس مذہب میں داخل ہونے سے اُن کو مادی طاقت حاصل ہوئی تو

مذہب کے ذریعے سے دنیا میں کیا کیا کیا گیا۔ کتنے فسادات برپا کئے گئے، ان فسادات کو جو انسان دیکھتا ہے تو دل چاہتا ہے کہ مذہب کی طرف سے آنکھیں بند کرلے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ کہتے ہیں مذہب مٹا دینے کے قابل ہے اسی لئے کہ مذہب سرچشمہ فساد ہے بہر حال اس میں کیا شبہہ کہ دنیا کی تاریخ ان ہولناک مظالم سے پر ہے۔ دنیا والوں نے اپنے اغراض و مقاصد کو مذہب کے پردہ میں حاصل کرنے کی کوشش کی اور مذہب کو ذریعہ قرار دیا اپنے مقاصد کی کامیابی کا اسلئے کہ یہاں مذہب سے مراد کوئی خاص مذہب نہیں ہے بلکہ "لا مذہبیت" کے مقابلہ میں جس کو دنیا مذہب کہتی ہے اس کے نام پر دنیا میں جتنے فسادات اب بھی ہوتے ہیں اتنے فساد کسی اور شے کی بنیاد پر کم رونما ہوتے ہوں گے۔

بات یہ ہے کہ ہر انسان اپنے مقصد میں کامیابی میں کسی بڑی طاقت ہی کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ دنیا میں چونکہ مذہب سے بڑھ کر کوئی شے افکار عالم کو متاثر کرنیوالی نہیں ہے اس لئے بدنیت انقلاب پیدا کرنے والوں نے اس کا سہارا زیادہ ڈھونڈھا اور پھر مذہب وہ چیز ہے جس کی بنیاد تقدس اور پاکیزگی نیز عقیدتمندی پر ہے اس لئے اسکا نام آنے کے بعد نقد و تبصرہ کی ہمت لوگوں میں کم رہ جاتی ہے اسلئے وہ لوگ جو دنیا کو اندھا بنا کر اپنے اغراض و مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں مذہب سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں ملتی اس لئے وہ اپنے مقاصد کو مذہب کا لباس پہناتے ہیں اور مذہب کا نام لیکر علم بلند کرتے ہیں۔

عائد کی جاتی ہے صرف اس لئے کہ وہ خاموش طاقت ہے مگر مذہب اپنی بے زبانی کیساتھ ان اہل مذاہب کا شاکی ہے جو اُس کے نام پر دنیا کے امن و امان کو برباد کریں اور خاموش فضا میں اضطراب پیدا کریں۔

میں نے تھوڑی دیر ہوئی یہ کہا تھا کہ مذہب اگر الگ ہے اور حکومت الگ تو ہر ایک ان میں سے دنیا کی تباہی کے لئے کافی ہے لیکن اگر مذہب حکومت میں سمو دیا جائے تو پھر جتنے فسادات اس سے برپا ہو سکتے ہیں اُن کی کوئی حد نہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال سلاطین بنی اُمیہ کے دور سلطنت میں ملی۔ یہاں سلطنت اور مذہب سمو دیا گیا تھا یعنی وہ دو چیزیں جنمیں ہر ایک فساد فی الارض کا بے پناہ ذریعہ ہے یہاں دونوں بہم ہو گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا "فساد فی الارض" کی دنیا میں واقعۂ کربلا سے بڑھ کر کوئی مثال مل سکتی ہے۔

یہ واقعۂ کربلا کس بنیاد پر ہوا۔ مذہب اور حکومت کی سموئی ہوئی طاقت کے اوپر میں آپ کے سامنے تاریخ سے دلائل پیش کرونگا کہ حسین بن علی کو قتل کرنے والے دنیا کو یہ دکھلا رہے تھے کہ ہم مذہب کی ایک خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ مذہب کے نام پر اپنے مقاصد کو پورا کر رہے تھے۔ میں نے دکھلایا تھا کہ موسیٰ کو فرعون کی جماعت مفسد بتلا رہی تھی یعنی جو حقیقی مصلح ہوتا ہے اُس پر مفسد ہونیکا الزام عائد ہوتا ہے اور جو مفسد ہوتا ہے وہ مصلح بننے کی کوشش کرتا ہے۔

انھوں نے دنیا میں کیا کچھ کیا؟ اس کو تاریخ کے اوراق ابھی تک محفوظ کئے ہوئے ہیں یعنی ہزاروں آدمیوں کا خون پانی کی طرح بہہ گیا ہزاروں گردنیں زیر تیغ ہو گئیں۔ خاموش اور پرامن بے ضرر اشخاص کو لایا جاتا تھا اور اُن کے ہاتھ پیروں میں رسیاں باندھکر قوی ہیکل لوگ چاروں طرف سے کھینچتے تھے یہاں تک کہ اُن کے جوڑ بند جدا ہو جائیں ہتھیلیوں میں میخیں ٹھونکی جاتی تھیں زندہ آگ میں جلائے جاتے تھے۔ یہ تمام مظالم کس چیز کی بنا پر ہوتے تھے؟ اسی مذہب کی بنا پر جس کی تعلیم کاغذی حروف میں وہ لکھی نیز اس سے پہلے خود حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھانے کا اقدام کیا گیا۔ کس بنا پر؟ مذہب کی بنا پر یعنی وہ یہود ارباب مذہب تھے جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے قتل کا فتویٰ دیا اور کہا کہ انکا ہلاک کرنا لازم ہے اور وہ سلطنت ہی تھی جس کے ذریعہ سے اس تجویز نے عملی صورت اختیار کی۔

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے۔ دنیا میں صلیبی لڑائیاں جو لڑی گئیں جن کا مقصد اصلی صرف سیاست تھا وہ کس طرح مذہب کے نام پر برپا کی گئیں اور کس طرح سادہ لوح افراد کو اس مقدس جذبہ کے تحت میں نذر ہلاکت بنایا گیا۔

اب سمجھئے اس دور میں کہ مذہب کے نام پر کیا کیا فتنے اٹھائے جاتے ہیں اور اُن فتنوں میں مفاد عامہ کو کتنے عظیم نقصانات پہونچتے ہیں۔ بھولے بھالے افراد سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقتہً مذہب کے نام پر جان دے رہے ہیں لیکن مذہب خود اُنکے طرز عمل سے نالاں ہوتا ہے۔ خاموش مذہب کے اوپر اپنے اغراض و مقاصد کی ذمہ داری

پیش کرونگا جن میں حسین نے اس غلط فہمی کو دفع کیا ہے اور یہ دکھلاؤں گا کہ تاریخ نے امام حسینؑ کی کس طرح تصدیق کی۔ اسی طرح یہ دکھلاؤنگا کہ دوسروں نے حسین کے قتل کو مذہبی لباس پہنایا۔ میرے ہاتھ میں صرف یہ کتاب ہے جس کو تاریخ طبری کہتے ہیں ایسے محل پر میں سوائے اس کتاب کے کسی دوسری کتاب سے کام نہیں لیتا۔ اس لئے میں اسی میں سے آپ کے سامنے شواہد پیش کرتا ہوں جو میرے موضوع کلام سے تعلق رکھتے ہیں۔

میرا مقصود اُن حقیقتوں پر روشنی ڈالنا ہی جو میرے عنوان بحث سے متعلق ہیں الزام امام حسینؑ اور اُن کی جماعت پر "فساد فی الارض" کا لگایا جاتا ہے۔ حسینؑ اپنی صفائی پیش کرتے ہیں علمی صورت سے اور عملی طریقوں سے اس صفائی کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔

الزام کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جب حضرت مسلم بھیجے گئے ہیں۔ کیا وہ کوئی بغاوت کا قصد رکھتے تھے؟ اگر ایسا ہوتا تو مسلم وہ طرز عمل اختیار نہ کرتے جو کیا۔ یعنی سیاسی اصول پر جو حکومت و سلطنت کے مطابق ہے یہ دیکھیئے کہ کوفہ کے دارالامارہ میں حاکم موجود۔ مسلم امام حسین کی طرف سے بطور سفیر بھیجے جاتے ہیں۔ اگر مقصود ہوتا مادی طاقت سے تصادم کرنا تو سب سے پہلا فرض تھا مسلم کا کہ وہ دارالامارہ پر قبضہ کرتے۔ مگر مسلم کیا کرتے ہیں؟ گویا اس کا مظاہرہ کہ تمہاری سلطنت سے کوئی مطلب نہیں ہی تمہاری حکومت سے کوئی غرض نہیں ہی۔

کیا حسین بن علیؑ سے بڑھکر دنیا میں کوئی مصلح تھا؟ ہرگز نہیں کیونکہ اُس وقت دنیا فسادات سے پر تھی یعنی "فساد فی الارض کے تمام اقسام جمع ہو گئے تھے اُن حالات کے اندر جو واقعہ کربلا کے محرک ہوئے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیے کہ نظام اسلام میں انقلاب ہو رہا تھا اور بالکل ایک نئی صورت پیدا کی جا رہی تھی۔ ضرورت تھی اس بات کی کہ دنیا کو معلوم ہو کہ اصلی تعلیمات اسلام کیا ہیں۔ اور وہ اسلام جس کو رسولؐ لائے تھے وہ درحقیقت کیا ہے۔ اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے اور یہ دکھلانے کے لئے کہ دنیا کی موجودہ رفتار مفاد عامہ کے بالکل خلاف ہے امام حسینؑ نے عزم بالجزم کر لیا۔ حسین کا اقدام صرف اتنا تھا کہ آپ خود اُن افعال و اعمال میں شرکت سے انکار کر دیں بس اور کچھ نہیں۔ میں "اسوۂ حسینی" میں اس کو تفصیل سے تاریخی شواہد کے ساتھ بیان کر چکا ہوں کہ امام حسینؑ کی طرف سے اور کچھ نہیں ہوا تھا سوائے اس کے کہ میں بیعت نہیں کرتا۔ میں ان افعال و اعمال کی تائید نہیں کرتا۔ بس اتنا تھا لیکن یہ قانون کے خلاف تھا۔ قانون سلطنت کے خلاف اور اُس مذہب کے خلاف جس پر سلطنت کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ نتیجہ کیا ہوا۔ نتیجہ وہ ہوا جس کو دنیا جانتی ہے۔ حسین کے اوپر الزام قائم کیا گیا وہ کہ جو موسیٰ کے اوپر قائم کیا گیا تھا۔ موسیٰ پر فرعون کی طرف سے مفسد ہونے کا الزام لگایا گیا تھا مگر موسیٰ نے دلائل کے ذریعہ سے یہ دکھلا دیا کہ میں مفسد نہیں ہوں اسی طرح حسین نے اپنے طرز عمل سے، شواہد و دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ میں مفسد نہیں ہوں بلکہ علاوہ مفسد ہیں جنہوں نے میرے خلاف تلواریں کھینچی ہیں۔ بس آپ کے سامنے وہ شواہد

کام شورش پیدا کرنا نہیں ہے۔

آپ فرماتے ہیں "امام کے معنی کچھ اور نہ سمجھنا! امام کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ انسان جو کتاب خدا پر مکمل عمل کرنیوالا ہو اور عدالت کا پابند ہو اور حق کی پیروی کرنیوالا ہو اور اپنی نفسانی خواہشوں کو مقید کیے ہوئے ہو خدا کی ذات اور اسکی مرضی پر"۔

آپ کا مطلب صاف ہو گیا۔ یعنی میری جانب سے مادی طاقت کے استعمال کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیئے۔ میرے متعلق مفسدہ انگیزی کا خطرہ دل میں لانا چاہیئے۔ میں صرف احکام خداوندی پر چلنے والا اور دوسروں کو چلانیوالا ہوں۔

اب مسلم آئے۔ اور کوفہ میں قیام کیا۔ انکی کوشش ہر گز مفسدانہ نہ تھی لیکن مفسدین کے مقاصد انکی اصلاحی روش سے پامال ضرور ہوتے تھے اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کہ مسلم گرفتار کیے گئے ان تمام تفصیلات کے بعد جو آپکو معلوم ہیں۔ ان کا بیان کرنا مجھے مقصود نہیں ہے۔ اب جب مسلم گرفتار ہو کر ابن زیاد کے پاس لائے گئے ہیں تو اسوقت جو گفتگو ہوئی ہے اُسے ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ کیا الزام ہے جو مسلم پر عائد کیا جاتا ہے۔ ابن زیاد کہتا ہے۔

ایہ یا ابن عقیل اتیت الناس وامرھم جمیع وکلمتھم واحدۃ لتشتتھم وتفرق کلمتھم وتحمل بعضھم علی بعض۔

(یعنی) ابن عقیل۔ تم یہاں آئے ہو لوگوں میں تفرقہ ڈالنے اور ان میں آپس میں فساد کرانے کہ ایک جماعت دوسرے پر حملہ کرے اور جنگ کی صورت پیدا ہو"۔

جا کر مختار بن ابی عبیدہ کے مختصر مکان میں قیام کیا۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟
بیعت یعنی معاہدۂ وفاداری امام حسینؑ کے لئے۔ امام کے معنی کیا فوج کشی کرنیوالا جنگ و
جدال کرنیوالا؟ نہیں۔ اس غلط فہمی کو امام حسینؑ نے اُس خط میں جو سب سے پہلے
مسلم کے ساتھ بطور پیغام جماعت اہل کوفہ کے نام بھیجا گیا تھا دور کر دیا تھا گویا اس خط
سے دکھلا دیا تھا کہ میرا طرزِ عمل مصلحانہ ہے۔ مفسدانہ نہیں ہے۔ دنیاوی حیثیت سے لکھنا
کیا چاہیئے تھا؟ یہ لکھنا چاہیئے تھا کہ میں مسلم کو بھیجتا ہوں۔ تم ان کے ساتھ ہو کر
کوفہ کی برسرِ اقتدار حکومت سے برسرِ پیکار ہو۔ کوفہ کی فضا کو میرے لئے صاف کر دو۔
دارالامارہ پر قبضہ کر لو۔ پھر میں تمہاری جانب آتا ہوں۔
یہ ہونا چاہیئے تھا لیکن امام نے جو خط تحریر فرمایا ہے اس میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔
اس میں بس یہ ہے کہ تمہارے خطوط میرے پاس آئے۔ ان سب کا قریب قریب یہ مضمون
ہے کہ ہمارے لئے کوئی امام نہیں ہے لہٰذا آپ ہمارے پاس آیئے تاکہ آپکے ذریعہ سے
ہم کو ہدایت حاصل ہو اور ہم نقطۂ حقیقت پر متفق ہو جائیں۔ اس بنا پر میں اپنے
معتمد علیہ چچازاد بھائی کو بھیجتا ہوں۔ یہ مجھے تمہارے حالات و خیالات سے اطلاع
دینگے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔
فلعمری ما الامام الا العامل بالکتاب والاخذ بالقسط والدائن
بالحق والحابس نفسہ علیٰ ذات اللّٰہ "
یہ کہکر دکھلا دیا ہے کہ امام کبھی " فساد فی الارض " کا باعث نہیں ہوتا۔ اُسکا

خروج ۔ فساد کے الزامات عائد ہو جاتے بلکہ آپ فرماتے ہیں کہ ہم آئے ہیں اس لئے کہ تمہارے
افعال سے عام مسلمانوں کے اخلاق جو فاسد ہو رہے ہیں ہم اُن کی اخلاقی اصلاح کریں
چونکہ دنیا اپنے حکام کے افعال سے بہت متاثر ہوتی ہے ۔ لہذا تمہارے اُن اعمال و افعال سے
جو دماغی اور ذہنی انقلاب خلق خدا میں ہو رہا ہے ہم اس انقلاب کو روکنے کے لئے اور عدالت
وانصاف اور تعلیمات قرآن پر لوگوں کو عمل پیرا بنانے کے لئے آئے ہیں ۔

دیکھئے اس مختصر سی گفتگو سے فساد فی الارض کا رخ پلٹا یا نہیں ۔

مسلم نے صفائی پیش کر دی کہ نہ میں بانی فساد اور نہ فساد کی طرف دعوت دینے والا ۔
اور اگر در حقیقت بنیاد فساد قائم کی ہے تو تم نے اور تمہارے حامیوں نے اور تمہارے ذمہ دار
افراد نے لہذا ہم کو فساد سے کوئی تعلق نہیں ۔

یہ وہ واقعہ تھا جو سر نامہ ہے واقعات کربلا کا اب یہ چیز شروع ہو جاتی ہے فساد
فی الارض کا الزام، اس کا دفعیہ اور اپنی صفائی ۔ ملاحظہ ہو کہ حضرت سید الشہداء نے
عملی طور پر کس طرح سے کوشش کی اپنی مصلحانہ حیثیت کے نمایاں کرنے کی ۔

راہ میں حر کا ملنا اور اس موقع پر امام حسینؑ کا خطبہ جب نماز ظہر کا وقت آیا ۔
اور اذان ہوئی حضرت خیمہ کے باہر تشریف لائے اور مجمع کو مخاطب کر کے تقریر فرمائی ۔

ایھا الناس انھا معذرۃ الی اللہ عزوجل والیکم ۔

"میں چاہتا ہوں کہ خدا کے سامنے اور تم لوگوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کر دوں"
انی لم اتکم حتی اتتنی کتبکم وقدمت علیّ رسلکم ان اقدم علینا

فرد قرار داد جرم کا خلاصہ کیا تھا ؟ فساد فی الارض

اب مسلم کی طرف سے اس کا کیا جواب ہے ؟ بے شک اُس طرف مادی طاقت ہے مگر مسلم کو حق پر اعتماد ہے۔ الزام سنکر سکوت کرنا تصدیق جرم پر محمول ہونیکا امکان رکھتا ہے اس لئے مسلم نے جواب دیا اور وہ جواب جس نے آخر تک اقدام حسینی کے فلسفہ کو ظاہر کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں۔

کلا لست اتیت ولکن اهل المصر زعموا ان اباك قتل خیارهم وسفك دماءهم وعمل فیهم اعمال کسری وقیصر فاتیناهم لنأمر بالعدل وندعو الی حکم الکتاب

اُدھر سے فساد فی الارض کا الزام بالکل دعوائے بے دلیل کی حیثیت رکھتا تھا لیکن مسلم ایک ایک کرکے فساد فی الارض کی مثالیں پیش کر رہے ہیں اور دکھلا رہے ہیں کہ مفسد کون ہے۔ کہتے ہیں کہ میں اسلئے تو نہیں آیا ہوں کہ مفسدہ پردازی کروں بلکہ اس ملک والوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا اور لکھا تھا کہ تیرے باپ نے ان کے نیک آدمیوں کو قتل کیا اور اُن کے خون بہائے یہ ایک بات۔ دوسرے۔ اسلام کی سادگی کو مٹا کر وہ افعال واعمال اختیار کئے جو کسریٰ وقیصر کی سنت ہیں۔

یہ دونوں فساد فی الارض کی باتیں ہیں جو درحقیقت اموی سلطنت کے تمام دور کا خلاصہ ہے۔

اب جناب مسلم اپنے آنے کا مقصد بیان فرماتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ہم آئے ہیں کہ تمھاری طاقتوں کو پامال کر دیں۔ تم سے سلطنت چھین لیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر بغاوت

رأیکم علیہ ما انتنی کتبکم وقدمت بہ علیّ رسلکم انصرفت عنکم۔

"ایہا الناس۔ اگر تم انصاف سے کام لو اور حقیقت پر غور کرو اور صاحبان حق کے حق کو پہچانو تو یہ خدا کی رضامندی کا باعث ہے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان دعویداران خلافت کے مقابلہ میں جنھوں نے ظلم و تعدی کے افعال اختیار کئے ہم اہلبیت کا حق زیادہ مرجح ہے۔ بہرحال اگر تمہاری رائے وہ نہو جو تمہارے خطوط سے ظاہر ہوتی تھی اور جو تمہارے قاصدوں نے بیان کی تھی تو میں واپس چلا جاؤں"۔

اس مرتبہ حر نے جواب دیا جو بارہا آپ سن چکے ہیں کہ ان خط کے لکھنے والوں میں میں نہیں ہوں مگر یہ جواب کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ امام حسین ؑ نے کسی شخص خاص کو بحیثیت اس کی شخصیت کے مخاطب نہیں کیا تھا بلکہ جمہور اہل کوفہ کو مخاطب کیا تھا۔

بہرحال اس کے بعد راستے کی دوسری تقریریں ہیں۔ ان میں بھی آپ نے دنیا کے ان حالات پر تبصرہ فرمایا ہے جو فساد فی الارض کی حیثیت سے رونما ہیں۔

ایک مقام پر جس کا نام "بیضہ" تھا حضرت نے اصحاب حر اور اپنے اصحاب کے سامنے یہ تقریر فرمائی۔

دیکھئے۔ اسلام کے تعلیمات کا حوالہ دیتے ہوئے، اپنے فرائض کو دکھلاتے ہوئے، فساد فی الارض کے موقع پر مصلح حقیقی کا کیا فرض ہے اسے پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ایہا الناس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال من رأی سلطانا جائرا مستحلا لحرم اللہ ناکثا لعہد اللہ مخالفا لسنۃ رسول اللہ

فانہ لیس لنا امام لعل اللہ یجمعنا بك علی الھدی فان کنتم علی ذلك فقد جئتکم فان تعطونی ما اطمئن الیہ من عھودکم ومواثیقکم اقدم مصرکم وان لم تفعلوا وکنتم لمقدمی کارھین انصرفت عنکم الی المکان الذی اقبلت منہ الیکم۔

"میں تمہاری جانب نہیں آیا جبتک تمہارے خطوط نہیں گئے اور تمہارے قاصد میرے پاس نہیں پہونچے ان خطوط اور پیغاموں کا خلاصہ یہی تھا کہ آپ آیئے کیونکہ ہمارے لئے کوئی امام نہیں ہے شاید آپ کے ذریعے سے خدا ہم کو ہدایت پر مجتمع کر دے۔

اب اگر تم اپنی بات پر برقرار ہو تو میں موجود ہوں۔ تم مجھ سے وعدہ کرو اور اطمینان بخش عہد و پیمان کرو میں تمہارے شہر میں آنے کے لئے طیار ہوں اور اگر تم ایسا نہ کرو اور تم لوگ میرے آنے سے ناراض ہو تو میں واپس چلا جاؤں وہیں جہاں سے آیا ہوں۔"

اب دیکھیے کہ اس میں صلح پسندانہ عنصر کے علاوہ کوئی اور عنصر شریک ہے؟

اس خطبہ کا کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر دوسری تقریر عصر کے وقت نماز کے بعد آپنے فرمائی جس میں بعد حمد و صلوٰۃ مجمع کو مخاطب کر کے ارشاد کیا۔

ایھا الناس فانکم ان تتقوا وتعرفوا الحق لاھلہ یکن ارضی للہ ونحن اھل البیت اولی بولایۃ ھذا الامر علیکم من ھؤلاء المدعین مالیس لھم والسائرین فیکم بالجور والعدوان وان انتم کرھتمونا وجھلتم حقنا وکان

کی کوشش کرے"

یقیناً حسین سے بڑھکر کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ انھیں اسلام کے ساتھ جو خصوصیت تھی وہ کسی دوسرے کو نہ تھی۔ اس کی تفصیل میں کسی حد تک اپنے رسالہ "حسین اور اسلام" میں لکھ چکا ہوں۔

اسلام کا رسول کیساتھ کیا تعلق؟ رسول کیساتھ حسین کا کیا رشتہ؟ پھر اسلام اور حسین میں کیا ارتباط؟

میں سچ کہتا ہوں کہ رسول کے رشتہ کے لحاظ سے حسین اور اسلام میں وہی تعلق تھا جو ایک گود میں پرورش پانے والے دو بچوں میں ہوتا ہے تو اب اگر اسلام کے گلے پر چھری پھرے تو حسین سے زیادہ کون متاثر ہوگا۔

یہ سب کچھ ان الفاظ میں مضمر ہے کہ (انا احق من غیری) اسکے بعد فرماتے ہیں کہ

وقد اتتنی کتبکم وقدمت علی رسلکم ببیعتکم انکم لاتسلمونی ولا تخذلونی فان تممتم علی بیعتکم تصیبوا رشدکم۔

اور پھر تمھارے خطوط میرے پاس آئے اور تمھارے پیغام پہونچے کہ ہم آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں اس بات پر کہ آپ کو اکیلا نہیں چھوڑینگے اور آپ کی نصرت سے ہاتھ نہیں اٹھائینگے۔ اب اگر تم لوگ اپنی بیعت پر قائم رہو گے تو تمھارے ہی لئے اچھا ہوگا

فانا الحسین بن علی وابن فاطمۃ بنت رسول اللہ نفسی مع انفسکم واھلی مع اھلیکم فلکم فی اسوۃ۔

یعمل فی عباد اللہ بالاثم والعدوان فلم یغیّر علیہ بفعل ولا قول کان حقاً علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ ۔

(یعنی) ایہا الناس پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی بادشاہ کو دیکھے جو ظلم و جور کرتا ہے محرمات الٰہیہ کو حلال بنائے ہوئے ہے۔ خدائی عہد و پیمان کو توڑ رہا ہے اور سنت رسول کی مخالفت کرتا ہے۔ اور بندگان خدا میں معصیت خدا کا طرز اختیار کئے ہوئے ہے لیکن یہ شخص اُن باتوں کو گوارا کرے اور اصلاح کی کوشش نہ کرے نہ قولی اور نہ عملی تو خدا کو حق ہوگا کہ وہ اُسے اُسی بادشاہ کے درجہ میں محسوب کرے یعنی اُس کے گناہ میں اسے بھی شریک قرار دے کیونکہ اُس نے اپنے طرز عمل سے اُس کی ہمت افزائی کی اور اُس کے اعمال و افعال کو تقویت پہونچائی ۔

اس کے بعد آپ موجودہ حالت کو بیان فرماتے ہیں ۔

الا وان ھٰؤلاء قد لزموا طاعۃ الشیطان وترکوا طاعۃ الرحمٰن واظہروا الفساد وعطلوا الحدود واستأثروا بالفیئ واحلوا حرام اللہ وحرموا حلالہ وانا احق من غیّر ۔

"تمھیں معلوم ہوگا کہ ان بنی امیہ نے اطاعت شیطان کے مسلک کی پابندی کرلی ہے اور خدا کی اطاعت کو چھوڑ دیا ہے۔ دنیا میں فساد ظاہر کیا ہے اور حدود خدا کو معطل کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے اموال کو اپنا بنا لیا ہے اور حرام خدا کو حلال، حلال خدا کو حرام بنا دیا ہے۔ اس صورت میں مجھ سے زیادہ کسی پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ وہ اصلاح

خود ہی ضرر اٹھاتا ہے، اب ہامیں مجھے خدا کی رضامندی اور اسکی حمایت کافی ہے اور کسی کی ضرورت نہیں والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کتنی اطمینان اور سکون سلامتی کی تقریر۔ یہ اُس لشکر کے سامنے تقریر ہے جو آپ کو روکنے یا گرفتار کرنے کیلئے آیا ہے۔ یہ حر کے لشکر سے تقریر ہے جس کو والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ پہ ختم کیا جارہا ہے جس سے بڑھکر اعزاز اور مکمل سلام باآداب ہو نہیں سکتا۔

ان تمام تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ امام اپنا مقصد جنگ و جدال یا تفرقہ اندازی معرکہ آرائی نہیں قرار دیتے بلکہ اچھی باتوں کا حکم دینے کے لئے، بری باتوں سے روکنے کے لئے اخلاقی و مذہبی تعلیم دینے کے لئے انہی مقاصد کے واسطے اپنے آنے کی بنیاد قرار دیرہے ہیں۔ اب اس میں کونسی بغاوت ہے کونسی سرکشی ہے۔ کونسا فساد فی الارض ہے۔ مگر مادیت کے غرور سے سرشار طبائع وہ بہرحال اسی کو گوارا نہیں کرتے کہ کوئی ہماری باتوں کو برا سمجھے۔ چاہے وہ لڑے نہیں مگر اختلاف ہی رکھتا ہو۔ اسلئے الزام ہے الزام کیا ہے۔ وہی فساد فی الارض جس کے بعد دوسرا فریق مصلح قرار پاتا ہے۔

لیکن حسین برابر اپنے عمل سے مصلحانہ حیثیت کو ثابت کرتے رہے "اسوہ حسینی" میں اسکے متعلق کافی تبصرہ کیا گیا ہے۔

کربلا میں پہونچنے کے بعد۔ عمر سعد کی گفتگو اور امام کے شرائط میں یہ امر اس درجہ نمایاں ہو گیا کہ عمر سعد کو تسلیم کرنا پڑا کہ حسین مصلحانہ طریقہ کے کاربند ہیں اور سلجھے ہوئے ذہن سیدہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ ابن سعد کوئی اور نہیں وہ کربلا میں بجائے

"میں کوئی اور نہیں ہوں حسین ہوں علی کا فرزند اور رسولخدا کی بیٹی فاطمہ زہرا کا دلبند۔ یہ نہ سمجھو کہ میں دنیا کے مفسد پیشواؤں کی طرح تمہیں مصیبت میں مبتلا کر دوں گا اور خود اپنی جان بچاؤں گا دنیا کے لیڈروں کا طرز عمل یہی ہے کہ عام افراد کو آگ میں جھونک دو اور خود راحت و آرام کی زندگی بسر کرو۔ دوسروں کے گلے کٹوا دو اور خود صحیح سلامت اپنی جان بچاؤ۔ یہ ہی عام لیڈروں کا طرز عمل آپ فرماتے ہیں کہ میں ایسا نہیں ہوں میری جان تمہاری جان کے ساتھ ہے اور پھر میں تنہا نہیں ہوں میرے بچے اور عورتیں تمہارے بچوں اور عورتوں کے ساتھ ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم میرے ساتھ شرکت کرو اور جو مجھ پر گذرے اُس میں تم میرا ساتھ دو۔

وان لم تفعلوا ونقضتم عهدكم وخلعتم بيعتي من اعناقكم فلعمري ما هي لكم بنكر لقد فعلتموها بابي واخي وابن عمي مسلم والمغرور من اغتر بكم فحظكم اخطأتم ونصيبكم ضيعتم ومن نكث فانما ينكث على نفسه وسيغني الله عنكم والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته۔

"اور اگر تم ایسا نہ کرو گے اور اپنے عہد کو توڑ ڈالو گے اور میری بیعت اپنی گردنوں سے اتار ڈالو گے تو یہ تمہاری طرف سے کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ تم نے میرے باپ اور بھائی کے ساتھ یہی کیا اور میرے چچا زاد بھائی مسلم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔

حقیقتاً فریب خوردہ ہے وہ کہ جو تم سے فریب کھا جائے اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہاری ہی قسمت کا پھیر ہے اور تمہارا ہی نقصان ہے اور جو شخص عہد شکنی کرے وہ

کی صلاح ہے "۔

اب ملاحظہ کیا آپ نے کہ باقرار عمر سعد اصلاح امر اُمت کی صورت کس کی طرف سے پیدا ہوئی حسین کی طرف سے اور ایسی اصلاح جس سے مخالف کو بھی سرتابی کی مجال نہیں عمر سعد کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ ان صورتوں کو ضرور منظور کرنا چاہیئے۔ ان میں اُمت کی صلاح ہے۔ تو اب اگر یہ شرائط منظور نہ کئے جائیں تو اُمت کے لئے فساد ہے اور اس فساد کی ذمہ داری کس پر؟ اُس فریق پر جو اُن شرائط کو مسترد کرے۔

نتیجہ یہی ہوا یعنی ابن زیاد کی جانب سے یہ شرائط مسترد ہوئے جس کا محرک بخیال عمر سعد شمر بن ذی الجوشن تھا اور اس طرز عمل کو صاف طور سے عمر سعد نے فساد کا لقب دیا چنانچہ جب شمر عمر سعد کے پاس ابن زیاد کا نامہ لیکر آیا جس میں شرائط کی نامنظوری تھی اور حسین کے قتل کا تاکیدی حکم تو عمر سعد نے کہا: افسدت علینا امراً کنا رجونا ان یصلح "تو نے فساد پیدا کر دیا اُس معاملہ میں جس کے صلاح کی ہمکو اُمید تھی"۔

حسینؑ نے اتنا نمایاں کر کے پیش کیا مصلح اور مفسد کے فرق کو کہ اُس طرف کی جماعت والوں کو احساس ہونے لگا چنانچہ یہی بنیاد ہوئی حر کے اس طرف آجانے کی اور فوج عمر سعد سے کنارہ کشی کر لینے کی۔

چنانچہ جب شرائط مسترد ہو چکے اور لڑائی ٹھن گئی اُسوقت حر عمر سعد کے پاس آیا اور کہا افما لکم فی واحدۃ من الخصال التی عرض علیکم رضنا "یہ اتنے شرائط جو حسین نے پیش کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی قابل منظوری نہیں ہے؟

ابن زیاد اور ابن زیاد کوفہ میں بجائے یزید اور یزید شام کے تخت پر وہی حسین بن علی کا اصل حریف۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ عمر سعد پوری اموی طاقت کی نمائندگی کر رہا ہے عمر سعد نے سمجھ لیا کہ حسین درحقیقت اپنی طرف سے فساد نہیں چاہ رہے ہیں اور اُن کا طرز عمل فساد پر در نہیں ہے چنانچہ آپ نے جب اپنے شرائط پیش کئے اور عمر سعد کیبا تھ گفتگو واقع ہوئی اور یہ کہا کہ مجھے اِدھر اُدھر چلے جانے دو۔ اس موقع پر عمر سعد نے ابن زیاد کو خط لکھا جس کے الفاظ یہ ہیں:

اما بعد فان اللہ قد اطفأ النائرۃ وجمع الکلمۃ واصلح امر الامۃ ھٰذا حسین قد اعطانی ان یرجع الی المکان الذی منہ اتی او ان نسیرہ الی ای ثغر من ثغور المسلمین شئنا فیکون رجلا من المسلمین لہ مالھم وعلیہ ما علیھم۔

"خدا نے آگ کو بجھا دیا اور اختلاف کو دور کر دیا اور اُمت اسلامیہ کے معاملات کی اصلاح کر دی حسین اقرار کرتے ہیں کہ وہ جہاں سے آئے ہیں ہیں واپس چلے جائیں یا ہم انھیں روانہ کر دیں جس سرحد کی طرف مسلمانوں کی سرحدوں میں سے ہم چاہیں جہیں وہ ایک فرد مسلم کی سی زندگی بسر کریں"۔ اور ان تمام شرائط کے بعد آخر میں لکھا ہے وفی ھٰذا لکم رضی وللامۃ صلاح۔

"یہ وہ باتیں ہیں جن پر تم لوگوں کو راضی ہونا چاہیئے اور ان میں اُمت محمدیہ

یہ منظور ہی کر لینگے اور معاملہ ختم ہو جائیگا۔ اور اگر یہ معلوم ہوتا کہ یہ لوگ ان شرائط میں سے کسی کو منظور نہ کرینگے تو میں ہرگز ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کرتا۔

بہرحال قصور ہوا اور اب میں توبہ کرتا ہوں اور آپ سے معافی کا خواستگار ہوں

معلوم ہوا کہ وہ اُدھر تھا اس بنا پر کہ اُسے اُس فریق کی مفسدانہ حیثیت کا اس درجہ تک اندازہ نہ تھا اور ادھر آگیا اس لئے کہ مصلح اور مفسد کا فرق نمایاں ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ حسین کا طرزِ عمل عین اصلاح تھا اور اموی حکام کا رویہ سراسر تخریب اور فساد فی الارض ۔

اتنے کھلے ہوے مظاہراتِ اصلاح و حقانیت کے باوجود مفسدین نے فرزندِ رسول حسین بن علی کو بخیال خود موردِ الزام باقی رکھا اور اسی بنا پر وہ برتاؤ کیا جو ایک مفسد کے ساتھ کرنا چاہیئے ۔ قرآن مجید میں تذکرہ ہے کہ مفسد کے ساتھ کیا ہونا چاہیئے اور وہ کس سلوک کا مستحق ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔

انما جزآء الذین یحاربون اللہ ورسولہ و یسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف او ینفوا من الارض ذلک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم (مائدہ پ ۶)

" وہ لوگ جو خدا اور رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین خدا میں فساد برپا کرتے ہیں انکی سزا یہ ہے کہ اُن کو قتل کر دیا جائے یا سولی پر چڑھا دیا جائے یا اُن کے ہاتھ پاؤں قطع کر ڈالے جائیں یا اُن کو جلاوطن کر دیا جائے "

کتنی نمایاں صورت صلاح اور فساد کے امتیاز کی ! ایک شخص ہے کہ وہ صلح کی صورتیں اپنی جانب سے برابر پیش ہی کرتا جاتا ہے اور دوسرا فریق ہے کہ ان میں سے کسی شرط کو منظور ہی نہیں کرتا۔ صاف ظاہر ہے کہ پہلا فریق مصلح ہے اور دوسرا مفسد۔ عمر سعد کا بھی دل اس معاملہ میں اتنا شکست خوردہ تھا اور ضمیر سے اتنا مغلوب کہ اس نے صاف کہہ دیا۔ اما واللہ لوکان الامر لی لفعلت ولکن امیرک قد ابیٰ ذلک۔

"خدا کی قسم اگر میرا اختیار ہوتا تو میں ضرور منظور کر لیتا لیکن تمہارا امیر (ابن زیاد) نہیں مانتا۔"

بس حر کو اندازہ ہو گیا کہ عمر سعد کا ضمیر بھی حسین کی مصلحانہ حیثیت کا معترف ہے، اور یہ بات ہے کہ وہ طمع دنیا کی بنا پر ضمیر کے فیصلہ کے خلاف عمل کر رہا ہے اور فوج کی سرداری سے دستبردار نہیں ہو۔

لیکن حر ان ہوا و ہوس اور طمع و حرص کے شکنجوں سے آزاد تھا اس نے مصلح کا ساتھ دیا اور مفسد سے کنارہ کشی کی۔ وہ لشکر حسین کی طرف آ گیا اور بتلا دیا کہ میں پہلے کیوں ادھر تھا اور اب کیوں ادھر آ گیا۔

اس نے امام کی خدمت میں آکر کہا کہ میں قصوروار ضرور ہوں کہ آپ کو گھیر کر اس جگہ لے آیا۔ مگر یہ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ آپ کے تمام شرائط کو مسترد کر دینگے جو آپ پیش کر دینگے۔ میں نے خیال کیا تھا کہ میں کسی حد تک قانون کی خلاف ورزی بھی نہ کروں اور پھر نتیجۃً تو حسین بن علی ایسے شرائط پیش کرینگے جن میں کسی نہ کسی طرح

قرآن مجید میں ہے ۔

وقال فرعون ذرونی اقتل موسیٰ ولیدع ربہ انی اخاف ان یبدل دینکم او ان یظہر فی الارض الفساد (سورۂ مومن ۲۶)

"فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں۔ چاہے وہ اپنے خدا سے فریاد بھی کریں کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دینگے یا روئے زمین میں فساد پیدا کرینگے"۔

یہی الزام امام حسینؑ پر عائد کیا گیا تھا جو کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ جو فرعونی طاقتوں کی طرف سے ہونا چاہیئے تھا وہ ہو رہا تھا اور وہ جو مصلحین حقیقی کو کرنا چاہیئے کہ وہ دلائل کے ذریعہ سے اپنے کو بے جرم ثابت کر دیں وہ حسینؑ کی جانب سے ہوا جن کا جرم یہ قرار دیا گیا تھا کہ تم فساد فی الارض کے مرتکب اور دین سے منحرف ہو۔ اسکے مقابل میں مصلح حقیقی نے دلائل کے ذریعہ سے، اپنے طرز عمل کے ذریعہ سے، دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ میں مفسد نہیں ہوں اور نہ دین سے منحرف ہوں۔ اس طرح ثابت کیا کہ اب ہمارے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو دلائل و براہین سے کام لینے کی حاجت نہیں۔ وہ منوا گئے خود اپنے دور حیات میں اور اپنے طرز عمل سے انھوں نے تسلیم کرا لیا اُن لوگوں سے کہ جو فساد فی الارض کا الزام عائد کرنیوالے تھے مختلف طرح سے آپنے اپنی صفائی پیش کی۔ وہ ظہر کے وقت کا مکالمہ۔ پھر وہ عصر کی تقریر پھر وہ ثاشنہ کی منزل پر تقریر۔ پھر کربلا پہونچنے کے بعد عمر سعد سے گفتگو اور شرائط پیش کرنا

یہ وہ چیزیں ہیں جو بطور پاداش جرم مفسدہ کے لئے قرار دی گئی ہیں۔ میرا انداز بیان یہ نہیں ہے کہ میں مصائب بیان کر کے آپ کو متأثر کروں۔

بہر حال جو کہنا چاہتا ہوں اُس پر اشارۃً تبصرہ بھی ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ چند چیزیں فساد فی الارض کی پاداش میں قرآن نے ذکر کی ہیں وہاں ایک ایک کر کے انھیں تبلایا گیا تھا۔ یا یہ۔ یا وہ۔ یا وہ لیکن مفسدین فی الارض نے جنھوں نے اپنی طاغوتی طاقتوں کے برتے پر ایک مصلح حقیقی کو مفسد کا لقب دیدیا تھا انھوں نے اُس کے ساتھ وہ سب سلوک جمع کر دئیے۔ ممکن تھا کہ میں اس کو ان الفاظ میں بیان کرتا جس طرح مجلس میں بیان ہونا چاہیئے لیکن مجھے درحقیقت نفس مطالب کو آپ کے سامنے پیش کرنا ہے۔ آپ اس کو جب غور کیجیئے گا تو سمجھ میں آئیگا کہ جتنی چیزوں کو علیحٰدہ علیحٰدہ یا یہ کرو یا یہ کرو کے الفاظ میں ذکر کیا گیا تھا اُن کو اجتماعی صورت سے برتا گیا اس خدا کے نیک بندہ کیسا تھ، اُس مصلح عالم کے ساتھ جس کو اُنھوں نے اپنے مذاق میں مفسد سمجھا اور مفسد کی صورت سے دنیا کے سامنے پیش کیا اور پھر یہ سب کس بنا پر؟ مذہب کی آڑ لیکر دین کے پردہ میں وہ کہ جو مذہب کو فنا کر رہے تھے۔ وہ کہ جو دین اسلام کو تباہ کر رہے تھے وہ دنیا کو یہ دکھلاتے تھے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ درحقیقت دینی احکام کی بنا پر اور مذہبی تعلیمات کے ماتحت۔

ہم کو ملتا ہے یہ تذکرہ قرآن مجید میں کہ فرعون کی جانب سے جس طرح موسیٰ کو فساد کا مجرم ٹھہرایا گیا اسی طرح دین کے مٹانے کا الزام بھی موسیٰ پر عائد کیا گیا۔

کے لئے خود ایک صلح پسندی کی شان کا مظاہرہ تھا اسلئے کہ جنگ کی سواری ہی گھوڑا اور امن و اطمینان کی سواری ہی ناقہ ہے آپنے ناقہ پر سوار ہونے سے گو یاد دکھلایا تھا کہ میں اپنی طرف سے جنگ پر آمادہ نہیں ہوں۔ مجھے اسوقت وہ پورا خطبہ بیان کرنا نہیں ہے۔ اُس میں رسول کی حدیثیں یاد دلائی ہیں۔ اُن روایات کی صحت پر اصحاب رسولؐ کی گواہی حاصل کرنے کو ارشاد کیا ہے چنانچہ اس میں فرمایا ہے۔ اولیس حمزۃ سید الشہداء عم ابی کیا حمزہ جو سید الشہداء کے لقب سے ملقب ہیں وہ میرے باپ کے چچا نہیں تھے۔ اولیس جعفر الشہید الطیار ذو الجناحین عمی کیا جعفر طیار جنھیں قدرت نے بعد شہادت کے پرواز عطا کئے ہیں خود میرے حقیقی چچا نہ تھے۔

اولم یبلغکم قول مستفیض فیکم ان رسول اللہؐ قال لی ولاخی ھذان سید اشباب اھل الجنۃ۔

ملاحظہ ہو اتنا اعتماد سچائی پر کہ دشمن کے مجمع میں حدیث نقل کیجائے اور دل میں کھٹکا نہ ہو کہ کوئی جھٹلا دیگا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"کیا تمھیں متواتر روایت رسول کی نہیں پہونچی ہے جو حضرت نے میرے بارے میں اور میرے بھائی کے بارے میں ارشاد فرمائی تھی کہ یہ دونوں سردار ہیں جوانان اہل جنت کے" فان صدقتمونی بما اقول وھو الحق واللہ ما تعمدت کذبا منذ علمت ان اللہ یمقت علیہ اھلہ ویضر بہ من اختلقہ "اگر تم تصدیق کرو میری اور مان لو جو میں کہتا ہوں اُسے تو خیر اور حقیقت بھی ہے کہ میں جو کہتا ہوں وہ صحیح ہی ہے

ایسے ملائم کہ خود عمر سعد کی طبیعت پہ وزن پڑا اور اُس کو یہ اندازہ ہوا کہ بیشک حسین اصلاح کے طالب ہیں۔ اسکے بعد آخری موقع تک جبکہ اتمام حجت اپنے آخری حدود میں پہونچ چکی تھی اسوقت بھی اس چیز کو نہیں بھولے اُسوقت موقع سخت ضرور تھا مگر دنیا کے حوادث سے مضطرب ہونیوالا نفس وہ اس کا کبھی لحاظ نہیں کرتا۔ وہاں حق و باطل کا تفرقہ کیا جا رہا تھا۔ وہاں صلاح اور فساد کا الگ الگ نمونہ دکھلایا جا رہا تھا وہاں مفسد اور مصلح کا امتیاز دنیا کے سامنے نمایاں کیا جا رہا تھا اُسوقت جبکہ عاشور کا ہنگام تھا اور بس اب کچھ دیر دہ گئی تھی حق اور باطل کے اس آخری فیصلہ میں جو دنیا کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس مسئلہ کو حل کر گیا اُسوقت بھی امام حسین ؑ نے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور یہ دکھلا دیا کہ جب آج ظلم و استبداد کی اتنی طغیانی ہوا میں ہمیری بیکسی اور بے بسی کے عالم میں میرے مونھ پر مجھ کو کوئی مفسد فی الارض ثابت نہ کر سکا تو میرے بعد کسی کو کہنے کا کیا حق ہے۔

ذرا آپ ملاحظہ تو کیجئے کہ ایک لسان ایک طرف اور ہزاروں زبانیں دوسری طرف بے شک حق میں ایسی طاقت ہونا چاہیئے اور ایک لسان اپنی سچائی پر، اپنے حسن عمل پر اپنی صداقت پر اتنا اعتماد رکھتا ہو حسین نے اسوقت جبکہ اپنا گواہ کوئی نہ تھا اور دنیا دشمن تھی دنیا سے اپنی بے جرمی کا کلمہ پڑھوا لیا۔ وہ خطبہ جس کے ابتدائی فقرات کو بیان کر چکا ہوں "اسوہ حسینی" کے ذیل میں، وہ خطبہ جو حضرت نے ناقہ پر سوار ہو کر پڑھا تھا اور میں نے اُس مرتبہ بیان کیا تھا کہ یہ ناقہ کے اوپر سوار ہونا خطبہ پڑھنے

"کیا اتنی باتیں جو میں نے بیان کیں ان میں سے کوئی تمہارے روکنے کے لئے میرے خون بہانے سے کافی نہیں ہے"۔

پھر آپ نے ارشاد فرمایا فان کنتم فی شک من ھذا القول فتشکون انی ما انی ابن بنت نبیکم۔

اگر تمھیں اس حدیث میں شک ہے جو میں نے تمہارے سامنے پیش کی تو اس میں بھی کیا کوئی شک ہے کہ میں تمہارے نبی کا نواسا تمہارے پیغمبر کی اکلوتی بیٹی فاطمہ کا فرزند ہوں۔ فواللہ ما بین المشرق والمغرب ابن بنت نبی غیری منکم ولا من غیرکم انا ابن بنت نبیکم خاصۃ۔

دیکھئے امام حسینؑ اپنی واحد خصوصیت دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا ذکر نہیں ہے یہود، نصاریٰ مجوس دنیا کی کوئی قوم جو کسی نبی کو مانتی ہے اس تمام عالم کو مجموعی حیثیت سے فرض کرو تو یہ دیکھو کہ دنیا میں اس وقت کسی نبی کا کوئی نواسا بجز میرے نہیں ہے اور پھر میں تو یہودیوں کا نہیں، نصرانیوں کا نہیں، خاص تمہارے نبی کا نواسا ہوں، اب تک یہ وہ چیزیں تھیں جو اسلامی غیرت کو برانگیختہ کرتی ہیں اور اس کا احساس دل میں پیدا کرتی ہیں۔ اگر سینہ میں دل ہو اور دل میں انسانی ہمدردی کے جذبات لیکن اب فساد فی الارض کا الزام تھا جو مصلح کے دامن پر لگایا گیا تھا اسکے دفعیہ کے لئے فرماتے ہیں :-

اخبرونی انطلبونی بقتیل منکم قتلتہ او مال لکم استھلکتہ او

کیونکہ میں نے کبھی یہ جانتے ہوئے کہ خدا جھوٹ کو پسند نہیں کرتا کوئی غلط بات اپنی زبان پر جاری نہیں کی ہے"۔

وان کذبتمونی فان فیکم من ان سألتموہ عن ذلک اخبرکم سلوا جابر بن عبد اللہ الانصاری وابا سعید الخدری وسھل بن الساعدی وزید بن ارقم وانس بن مالک یخبروکم انھم سمعوا ھذہ المقالۃ من رسول اللہ صلی و لاخی۔

اگر تم میرے قول کو سچ نہ بھی سمجھو تو بھی تم میں زندہ ہیں ایسے لوگ کہ اگر ان سے دریافت کرو تو وہ تمھیں تبلادینگے۔ جاؤ جابر بن عبداللہ انصاری سے پوچھ لو۔ ابوسعید خدری سے دریافت کرلو۔ سہل بن سعد ساعدی۔ زید بن ارقم۔ انس بن مالک ان میں کسی ایک سے تحقیق کرلو۔ وہ تمھیں تبلادینگے کہ انھوں نے خود رسالتمآب ص سے میرے بارے میں اور میرے بھائی کے بارے میں یہ الفاظ سنے ہیں۔

ذرا آپ غور کیجئے کہ وفات رسول ص سے لیکر واقعہ کربلا تک کتنا عرصہ گذرا ہے؟ پچاس برس کا طویل زمانہ سنہ ۱۰ھ سے سنہ ۶۱ھ تک اس پچاس برس میں کتنے صحابہ تھے جو دنیا سے اٹھ گئے۔ انسان کی عمر طبیعی کے لحاظ سے یقینی ایک بہت بڑی اکثریت اصحاب نبی کی وہ ہے جو اٹھ چکی ہے اور اب کم مقدار میں صحابہ موجود ہیں لیکن ان میں سے موجود ہیں اتنے صحابہ شاہد عینی ہیں اور ذاتی علم رکھتے ہیں حدیث رسول کا جو حسنین کے بارے میں تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے روایت کے اس عظیم الشان تواتر کے درجہ کا جو اسے حاصل تھا۔ پھر ارشاد فرماتے ہیں۔ افما فی ھذا حاجز لکم عن سفک دمی

سردار تھا۔ گویا ہر ایک ان میں سے ایک خود نہیں تھا بلکہ ہر ایک ہزاروں آدمیوں کے
مجموعہ کا نام تھا اس لئے ان افسروں کو پکار کر آپ نے فرمایا۔ اے شبث بن ربعی
اے حجار بن ابجر۔ اے قیس بن اشعث۔ اے یزید بن حارث کیا تم نے مجھے نہیں لکھا
تھا کہ کھیتیاں لہلہا رہی ہیں۔ چشمے پانی سے چھلک رہے ہیں۔ لشکر آپ کی امداد
کے لئے طیار ہیں تشریف لائیے اور جلد آئیے"۔

"قاتلانِ حسین کا مذہب" رسالہ میں میں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ خطوط
جو عموماً جماعت شیعہ کی طرف سے گئے تھے اُن کے مضامین دوسرے تھے لیکن یہ خصوصی
خط جس میں ان خاص اشخاص کے دستخط تھے جو بعد میں واقعہ کربلا میں شریک ہوئے
اور جو سب سے آخر میں بھیجا گیا تھا اُس کا مضمون یہی تھا جس کا حوالہ امام نے دیا۔

اب معاملہ ان اشخاص کے لئے نازک تھا۔ چار آدمیوں کو پکارا جا رہا تھا کہ تم نے
مجھے کیا یہ نہیں لکھا تھا؟ اتنے مجمع کے سامنے گویا اس بڑے مجمع کے سامنے ان لوگوں
کی سازش کا اور منافقت کا انکشاف ہو رہا تھا اور خود اپنی حکومت سے ایک طرح
کی بغاوت اُن کی ثابت ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ لوگ کوفہ کے بڑے سربرآوردہ اشخاص
تھے اور ابن زیاد کی طرف سے بڑے معزز عہدوں پر فائز تھے! اُنھوں نے اس موقع پر
یہ خط ہوا کے رخ کو دیکھ کر لکھا تھا کہ حسین کے نام اتنے کثرت سے خطوط جا رہے ہیں
اور دعوت دی جا رہی ہے اگر کہیں حسین آ گئے اور فضا اُن سے موافق ہو گئی تو ہمارے
لئے بھی جگہ باقی رہے اپنے ان عہدوں پر قائم رہنے کی۔ اس لئے اُنھوں نے

بقصاص من جراحۃ ۔

"ذرا مجھے بتلاؤ، میری نسبت فساد فی الارض کی کوئی مثال پیش کرو کیا کسی کا میں نے
خون بہایا ہے جس کا مجھ سے بدلا لینا چاہتے ہو یا تمہارا کچھ مال و دولت میں نے برباد
کر دیا ہے اُس کا عوض منظور ہے یا کسی کو کوئی معمولی سا زخم بھی میں نے لگایا ہے جس کا قصاص
لیا جا رہا ہے ۔ تمام لشکر کو دعوت دی جا رہی تھی کہ کوئی شخص کسی جرم کا پتہ دیدے ۔
کوئی گناہ ثابت کر دے ۔

ہوتا کوئی جرم کسی کی نگاہ میں تو اس ۳۰ ہزار کے مجمع میں کوئی زبان کھولتا ۔
کیا دنیا کی کوئی مادی طاقت زبانوں کو روکنے والی تھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کی طاقت
تھی جو ہونٹوں پر قفل اور زبانوں پر گرہ لگائے ہوئے تھی جس کی بنا پر ایک فرد فرید
انسان اس طرح دعوت دے رہا تھا کہ کسی کو اُسکے خلاف زبان کشائی کی جرأت نہیں
تھی سب خاموش تھا اور کسی نے کچھ جواب دیا ۔ اب حضرت خصوصی حیثیت سے مخاطب ہوئے
حُر سے گفتگو میں یہ صورت پیش آ چکی تھی کہ جب اجتماعی صورت سے اہل کوفہ کی طرف نسبت
دیکر یہ کہا گیا کہ تم نے مجھے خطوط لکھے تو حُر نے کہا کہ میں تو خطوط لکھنے والوں میں
نہیں تھا ۔ اس لئے اس موقع پر اُن لوگوں کو مخاطب کر کے جنھوں نے خطوط
بھیجے تھے پکارا ۔

یہ لوگ معمولی درجے کے سپاہی نہ تھے ۔ اگر معمولی درجے کے سپاہی ہوتے تو انکو
پکارنیکا کوئی حاصل نہ تھا لیکن یہ لوگ وہ تھے جنمیں سے ہر ایک ہزار ہزار کا دمیوں کا

یہ آخری موقع تھا کہ جس کے بعد تمام حجت کی منزلیں ختم ہو گئیں جس کے بعد پھر اُدھر سے تیر آنے لگے، پھر جنگ میں کوئی موقع تاخیر کا باقی نہ رہا۔ اس کے بعد آپ کے اصحاب و انصار سب امام کے راستے کے سالک، سب امام کے قدم بقدم تھے۔ ہر ایک نے نصیحت کی، ہر ایک نے دعوت دی۔ زہیر بن القین باہر نکلے ہتھیاروں سے آراستہ لوہے میں ڈوبے ہوئے پکار کر کہا: یا اهل الكوفة نذار لكم من عذاب الله نذار "اے اہل کوفہ خدا کے عذاب سے تم کو ڈراتا ہوں، خوف خدا سے کام لو"۔

ذرا دیکھئے لب لہجہ پر غور کیجئے۔ انتقام کے جذبات کا پتہ نہیں۔ اتنے مظالم کے بعد۔ اتنی سختیوں کے بعد بھی ہمدردی کا پہلو ہے۔ فرماتے ہیں:-

ان حقا على المسلم نصيحة اخيه المسلم ونحن حتى الآن اخوة وعلى دين واحد وملة واحدة مالم يقع بيننا وبينكم السيف وانتم للنصيحة منا اهل فاذا وقع السيف انقطعت العصمة وكنا امة وانتم امة -

دیکھو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے برادر مسلم کو خیر خواہی کے ساتھ نصیحت کرے اور سچا مشورہ دے اور ہم تم ابھی تک بھائی بھائی ہیں اور ایک ہی دین، ایک ہی ملت پر ہیں جبتک عملی طور پر تلوار ہمارے درمیان میں نہ کھنچے اُس وقت تک تم مستحق ہو اس بات کے کہ ہم تم کو نصیحت کریں اور نیک صلاح دیں لیکن جب ہمارے تمہارے درمیان تلوار کھنچ جائے تو اب ہمارے درمیان سے اخوت اسلامی کا رشتہ قطع ہو جائیگا۔ پھر ہم ایک فرقہ ہونگے اور تم دوسرا فرقہ۔

یہ خط بھیجا تھا مگر یہاں سازش منکشف ہو رہی تھی۔ اب محل تھا اس کا کہ کربلا کے واقعہ کے بعد ابن زیاد کے ہاتھ سے ان لوگوں کا فیصلہ ہو جائے اور وہ خود اپنی سلطنت کی جانب سے راندہ بارگاہ قرار دئے جائیں۔

اسلئے بربنائے ضرورت اُن کو یہاں پہونچنا ناگزیر تھا۔ مگر بولنا بے غیرتی کے ساتھ۔ وہ بولنا جس میں خود چہرہ کی ہوائیاں بولنے والے کے جھوٹ کی ترجمانی کر دیتی ہیں! اُنھوں نے کہا اور وہی کہا جواب بھی برابر عدالتوں میں ہوا کرتا ہے۔ یعنی تحریر سے انکار کیا اور کہا کہ ہم نے اس طرح کے خطوط نہیں لکھے تھے۔ ظاہر ہے اُس وقت اس کا کوئی ثبوت بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

امام نے فرمایا سبحان اللہ بلی واللہ لقد فعلتم۔

مطلب یہ تھا کہ اللہ اکبر اتنا کھلا ہوا بھی حقیقت کا انکار ہوتا ہے۔ تم نے لکھا اور یقیناً لکھا۔

اسکے بعد ارشاد کیا ایھا الناس اذ کرھتمونی فدعونی انصرف عنکم الی مامنی من الارض۔

اچھا اگر تم نے نہیں لکھا نہ سہی۔ اب گویا جتنی پہلی باتیں تھیں وہ سب ختم ہو گئیں وہ حدیث نہ سہی۔ وہ امتیازات نہ سہی۔ وہ خطوط نہ سہی لیکن اب بھی یہ صورت ہے کہ اگر تم میرے آنے کو ناپسند کرتے ہو تو مجھے واپس چلا جانے دو جہاں سے میں آیا ہوں"۔

جاری ہے۔ حجر بن عدی اور اُنکے ساتھیوں کا قتل کرنے والا کون تھا۔ یہ حجر اصحاب رسول میں سے تھے مگر ان کو قتل کرا دیا گیا۔ انکے قتل سے تمام عالم اسلامی میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی چنانچہ ام المومنین عائشہ نے خود معاویہ سے کہا اما خشیت اللہ فی قتل حجر و اصحابہ "تم نے حجر اور اُن کے اصحاب کے قتل میں خدا سے خوف نہ کیا؟"

اور عبد الرحمٰن بن عمر نے جب یہ واقعہ سنا تو چیخیں مار مار کر رونے لگے تھے۔

حجر بن عدی آن بلند مرتبہ فضلائے صحابہ میں سے تھے جن کے افعال شرع کے احکام میں بطور سند پیش کئے جاتے تھے۔ چنانچہ محمد بن سیرین سے جب دریافت کیا گیا کہ دو رکعت نماز قتل کے وقت پڑھنا شرع میں وارد ہے یا نہیں۔ تو اُنھوں نے کہا کہ صلاھما خبیب و حجر وھما فاضلان یہ دو رکعت نماز قتل کے وقت خبیب اور حجر ان دونوں بزرگوں نے پڑھی تھی اور یہ دونوں فاضل صحابہ میں سے تھے،

معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ میں ان کے افعال سے استناد کیا جاتا تھا ایسے جلیل القدر انسان کو جب قتل کیا جائے تو کیا یہ فساد کا مصداق نہ ہوگا۔

زہیر بن قین کی اس تقریر کا جواب کیا تھا؟ وہی جو ہر بے جواب انسان دیتا ہے۔ لوگوں نے گالیاں دینا شروع کر دیں اور کہا کہ اب ان باتوں سے کام نہیں چلیگا ہم تمھیں بھی قتل کریں گے اور تمھارے سردار کو بھی۔ جبتک دنیا کی تاریخ میں یہ گفتگو اور اس کا جواب موجود ہے دنیا کے سامنے ظاہر ہے کہ مصلح

ان اللہ قد ابتلانا وایاکم بذریۃ نبیہ محمدؐ لینظر ما نحن وانتم عاملون۔

"خدا نے ہمارا اور تمہارا امتحان لیا ہے اپنے نبی کی اولاد کے بارے میں تاکہ معلوم ہو کہ ہم تم کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں"۔

انا ندعوکم الی نصرھم وخذلان الطاغیۃ عبید اللہ بن زیاد فانکم لا تدرکون منھما الا بسوء عمر سلطانھما کلہ لیسملان اعینکم و یقطعان ایدیکم وارجلکم ویمثلان بکم ویرفعانکم علی جذوع النخل و یقتلان اماثلکم وقراءکم امثال حجر بن عدی واصحابہ وھانئ بن عروۃ واشباھہ۔

"ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ ان کی امداد کرو اور سرکش اور طاغی عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ نہ دو"۔ اب ملاحظہ ہو فساد فی الارض کے اقسام کی فہرست جو زیاد اور اسکے بیٹے عبید اللہ کی طرف سے رونما ہوئے ہیں: "دیکھو تو ان دونوں کے زمانۂ سلطنت میں تمہارے لئے سوائے برائی کے کوئی اچھائی نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ تمہاری آنکھوں میں سلائیاں پھیرواتے رہے ہیں، تمہارے ہاتھ پاؤں قطع کراتے رہے ہیں، تمہیں سولیوں پر چڑھائے جاتے رہے ہیں اور تمہارے اچھے لوگوں کو اور حفاظ قرآن کو جیسے حجر بن عدی اور انکے ساتھی اور ہانی بن عروہ ایسے اشخاص کو قتل کرتے رہے ہیں۔

مسلمہ واقعات کا حوالہ ہے۔ فساد کی یقینی مثالیں ہیں۔ نام لے لے کر بتلایا

جا رہا ہے۔ حجر بن عدی اور اُن کے ساتھیوں کا قتل کرنے والا کون تھا۔ یہ حجر اصحاب
رسول میں سے تھے مگر ان کو قتل کرا دیا گیا۔ ان کے قتل سے تمام عالم اسلامی میں غم و
غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی چنانچہ ام المومنین عائشہ نے خود معاویہ سے کہا اما
خشیت اللہ فی قتل حجر و اصحابہ "تم نے حجر اور اُن کے اصحاب کے قتل میں خدا سے
خوف نہ کیا؟"۔

اور عبد الرحمن بن عمر نے جب یہ واقعہ سنا تو چیخیں مار مار کر رونے لگے تھے۔

حجر بن عدی آن بلند مرتبہ فضلائے صحابہ میں سے تھے جن کے افعال شرع کے
احکام میں بطور سند پیش کیے جاتے تھے۔ چنانچہ محمد بن سیرین سے جب دریافت کیا گیا
کہ دو رکعت نماز قتل کے وقت پڑھنا شرع میں وارد ہے یا نہیں۔ تو انھوں نے کہا
کہ صلاھما خبیب و حجر وھما فاضلان یہ دو رکعت نماز قتل کے وقت خبیب اور
حجر ان دونوں بزرگوں نے پڑھی تھی اور یہ دونوں فاضل صحابہ میں سے تھے،

معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ میں ان کے افعال سے استناد کیا جاتا تھا ایسے
جلیل القدر انسان کو جب قتل کیا جائے تو کیا یہ فساد کا مصداق نہ ہوگا۔

زہیر بن قین کی اس تقریر کا جواب کیا تھا؟ وہی جو ہر بے جواب انسان
دیتا ہے۔ لوگوں نے گالیاں دینا شروع کر دیں اور کہا کہ اب ان باتوں سے
کام نہیں چلیگا ہم تمھیں بھی قتل کریں گے اور تمھارے سردار کو بھی۔ جبتک دنیا کی
تاریخ میں یہ گفتگو اور اس کا جواب موجود ہے دنیا کے سامنے ظاہر ہے کہ مصلح

ان اللہ قد ابتلانا وایاکم بذریۃ نبیہ محمدؐ لینظر ما نحن وانتم عاملون۔

"خدا نے ہمارا اور تمہارا امتحان لیا ہے اپنے نبی کی اولاد کے بارے میں تاکہ معلوم ہو کہ ہم تم کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں"۔

انا ندعوکم الی نصرھم وخذلان الطاغیۃ عبید اللہ بن زیاد فانکم لاتدرکون منھما الا بسوء عمر سلطانھما کلہ لیسملان اعینکم و یقطعان ایدیکم وارجلکم و یمثلان بکم و یرفعانکم علی جذوع النخل و یقتلان اماثلکم وقراءکم امثال حجر بن عدی واصحابہ وھانی بن عروۃ واشباھہ۔

"ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ ان کی امداد کرو اور سرکش اور طاغی عبید اللہ بن زیاد کا ساتھ نہ دو"۔ اب ملاحظہ ہو فساد فی الارض کے اقسام کی فہرست جو زیاد اور اسکے بیٹے عبید اللہ کی طرف سے رونما ہوئے ہیں: "دیکھو تو ان دونوں کے زمانۂ سلطنت میں تمہارے لئے سوائے برائی کے کوئی اچھائی نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ تمہاری آنکھوں میں سلائیاں پھرواتے رہے ہیں تمہارے ہاتھ پاؤں قطع کراتے رہے ہیں، تمہیں سولیوں پر چڑھائے جاتے رہے ہیں اور تمہارے اچھے لوگوں کو اور حفاظ قرآن کو جیسے حجر بن عدی اور انکے ساتھی اور ہانی بن عروہ ایسے اشخاص کو قتل کرتے رہے ہیں۔

مسلمہ واقعات کا حوالہ ہے۔ فساد کی یقینی مثالیں ہیں۔ نام لے لے کر بتلایا

امام وقت کی مخالفت کی ہے"
چونکہ یہ الزام صحیح نہ تھا ممکن نہیں تھا کہ مجسمۂ حق امام اس پر سکوت کرکے گویا اس کو تسلیم کر لے۔
ہم نے دکھلایا کہ تیس ہزار ایک طرف اور ایک داعیِ حق ایک طرف اور یہ ایک صدا بلند تھی جو اتنے بڑے مجمع کے سامنے حق کو ظاہر کر رہی تھی اور ان کی فسادکاریوں کا پتہ دے رہی تھی۔ اور اس ایک کی آواز پر ان کو جرأت نہ تھی کہ وہ کچھ کہہ سکیں لیکن اب معاملہ برعکس ہے۔ اب وہ حسینؑ پر الزام قائم کر رہے ہیں۔ حسینؑ خاموش رہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مذکورہ بالا الفاظ کا سننا تھا کہ امام نے فرمایا۔

یا عمرو بن الحجاج اعلیّ تحرض الناس نحن مرقنا وانتم ثبتّم علیہ اما واللہ لتعلمنّ لو قد قبضت ارواحکم ومتّم علی اعمالکم اینا مرق من الدین ومن ھو اولی بصلیّ النّار۔

"اے عمرو بن حجاج۔ تو میرے خلاف لوگوں کو آمادہ کر رہا ہے؟ کیا ہم دین سے نکل گئے ہیں اور تم دین پر قائم ہو؟ اس استفہام انکاری میں ایک دنیا ہے اظہار حق کی جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موازنہ کی صورت سے قائم ہے عقلائے عالم کے دماغوں کے سامنے اور منصفین دنیا کی نگاہوں کے آگے۔ اس طرف کا طرز عمل اور اس طرف کا دونوں پیش ہیں اور ہمیشہ پیش رہیں گے۔ اور یہ الفاظ

کون اور مفسد کون؟

باوجودیکہ یہ امر صاف طور سے ظاہر ہو گیا کہ کس کی جانب سے اصلاح تھی اور کس کی جانب سے فساد مگر پھر بھی امام حسینؑ کے مخالف اپنے افعال کو حمایت دین کا لباس پہنانا چاہتے تھے اور اپنے عمل کو مذہب کے تحت میں بتلا رہے تھے اور اُس ہمہ تن مجسمۂ دین کو۔ ہاں ہاں یہ حقیقت ہے کہ مجھے اسلام کو سمجھانے کے لیے کہا گیا ہے؟ حسینؑ کی شخصیت سے بڑھکر حوالہ نہیں ملتا ہے۔ میں اسلام کے عملی معنی حقیقی طور پر سمجھاؤں گا تو ایک ہی شخص دنیا کی تاریخ میں پیش کرنے کیلئے ملیگا جس کا نام ہے حسینؑ۔

مگر اُس کے خلاف الزام کیا ہے؟ وہ ہی جو موسیٰ کے خلاف فرعون کی طرف سے عائد کیا گیا تھا کہ وہ تمھارے دین میں تبدیلی کر رہے ہیں حسینؑ کو کہا جاتا تھا کہ وہ معاذاللہ دین سے منحرف ہو گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو تاریخ کا یہ واقعہ کہ جب جنگ چھڑ چکی ہے اور چند اصحاب شہید ہو چکے ہیں۔ اس موقع پر عمرو بن حجاج اپنی جماعت کو ترغیب و تحریص کرتا ہے اور وہ کہتا ہے۔

یا اهل الکوفة الزموا طاعتکم وجماعتکم ولا ترتابوا فی قتل من مرق من الدین وخالف الامام۔

"اے کوفہ کے لوگو تم اطاعت کے راستے پر قائم رہو اور اپنی جماعت سے علیحدہ نہو اور کوئی شک نہ کرو ایسے شخص کے قتل کرنے میں جو دین سے نکل گیا ہے اور جس نے

باقی رہ گئی ۔

میں واقعہ کو ایسے الفاظ میں پیش کرنا چاہتا ہوں کہ غم انگیزی کا اثر اس کے معانی و نتائج کی طرف سے غافل نہ بنا دے۔ چاہتا ہوں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُسکے نتیجہ پر آپ غور کریں۔ یہ تذکرہ بھی اُن الفاظ میں کروں جو مصیبت کے شایان شان ہیں اور اسمیں اثر غم پیدا نہو تو مصیبت کی توہین ہے اور اگر مصیبت کا اثر ڈالنے کا ارادہ کروں تو میرا مقصد فوت ہوجائیگا۔ ذرا اس موقع پر مجھے دشواری محسوس ہوتی ہے۔ میں تذکرہ وہ کروں جو جلسۂ وعظ کو مجلس بنا دے کیونکہ تذکرہ ہی ایسا ہو جو غم ڈالے بغیر رہ نہ سکے لیکن اگر آپ اس سے اثر لیکر جذبات غم میں مستغرق ہوگئے تو جو نتیجہ میں چاہتا ہوں اُس پر غور کرنیکا محل باقی نہ رہیگا اسلئے الفاظ وہ استعمال کرنا چاہتا ہوں جو تذکرۂ غم کو عقلی لباس میں پیش کریں ۔

بہرحال وقت وہ ہے کہ مادی طاقت نے اپنی فتح کا مجسمہ ملک کے سامنے پیش کردیا ہے گویا باطل نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی ہے اور اپنی جانب سے حق کو پست کرنے کی کوئی تدبیر اُٹھا نہیں رکھی ہے مگر وہ حق ناحق ہے جو ایسے موقع پر واقعی دب جائے ۔

ملاحظہ کیجئے ذرا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نکالئے۔ تلاش کیجئے کہ ایک کمزور مخلوق جس کا نام ہے عورت وہ اس محل میں اور ایسے نازک وقت میں اُس جادہ پر قائم رہے ہے جس پر ہم کربلا میں حسینؑ کو دکھلا رہے تھے ۔

کانوں میں بار بار گونجنے لگے ۔ لہٰ :- اعنی مرقنا وانتم ثبتم علیہ" کیا ہم دین سے نکل گئے اور تم دین پر قائم ہو ۔ پھر فرماتے ہیں ۔

اس کا پتہ تم کو اُس وقت چلیگا جب تمھاری روحیں ان کی خاک کے جسد دل سے جدا ہونگی اور انہی اعمال کے اوپر تم دنیا سے روانہ ہوگے ۔ اُس وقت معلوم ہوگا کہ ہم میں سے کون دین سے نکلا تھا اور کون آتش جہنم میں جلنے کا واقعی حقدار ہے ۔"

بے شک حسینؑ کا قتل مذہب کے نام پر ہو رہا تھا ۔ مذہب کے پردہ میں ہو رہا تھا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ حقوق ساقط کئے جاتے جو ایک مسلمان کو شریعت کی طرف سے حاصل ہیں مجھے مصیبت کے تذکرہ کی عادت نہیں کہ میں اُن الفاظ میں نہیں کہنا چاہتا جو اس جلسہ وعظ کو مجلس مصائب بنادیں مگر اپنا مطلب سمجھانا بھی ضروری ہے میرا مطلب ہے کہ کچھ حقوق وہ ہیں جو اسلام نے ہر مسلمان کے لئے قرار دئے ہیں لیکن حسینؑ کے لئے ان حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا ۔

اب سنئے موقع نازک سے نازک تر ہوتا جاتا ہے ۔ حق اور باطل کا فیصلہ ہو چکا اور اب وہ وقت ہے کہ داعی حق کے باقیات الصالحات مرکز فساد میں لائے گئے ہیں ۔ داعی حق کے باقیات الصالحات یعنی اہل حرم ۔ مرکز فساد یعنی ابن زیاد کا پایہ تخت اپنے خیال میں فتح حاصل کرنے والا سرکش انسان فتح و ظفر کے نشہ میں غرور کیساتھ تخت پر متمکن ہے اور اپنی فتح کے مظاہرہ کا انتہائی نمایاں نقشہ پیش کر رہا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اسوقت حق کی پامالی میں کوئی کمی اور باطل کی فتح میں کسی کی کسر

بڑی سیاسی غلطی تھی اہلبیت کو یوں لیجانا ایک جگہ سے دوسری جگہ۔ یہ صرف جذبات نفسی اور مادی فتح کے نشہ میں کام ہوا ہے اور اس کا مظاہرہ کیا گیا ہے لیکن سیاست کے اعتبار سے یہ بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ اس طرح درحقیقت حسینؑ کی خاموش زبان کو گویا کر دیا۔ ورنہ اہلبیت حسینؑ لاکھ چاہتے اُن کو نشر و اشاعت کا موقع کہاں ملتا مگر دشمن خود ذریعہ بن گئے اس مقصد میں کامیابی کا آپ ملاحظہ کیجئے کہ وہ مقامات، وہ جگہیں جہاں اہتمام کیا گیا تھا اس کے پہلے حق کی پردہ داری کا وہاں واقعات کا انکشاف کس طرح ہوا۔ اگر نہوتا جو کچھ کیا گیا تو یہ نتیجہ کیونکر برآمد ہوتا۔ ان مقامات پر ظالم اور مظلوم کا نقشہ کیونکر پیش ہوتا۔

وہ سب سے پہلا موقع عبرت۔ ابن زیاد کا دربار۔ بیشک وہ حکم اسلامی جو عورت کیلئے پردہ کے متعلق ہے رہنمائے اسلام کے ذمہ دار افراد بہر حال جہانتک اپنے سے متعلق ہے اپنے طرز عمل سے وابستہ ہے خود آنکو اس کا اہتمام بہر وقت مد نظر تھا اسلئے یہاں یہ ہے کہ لبست زینب بنت فاطمۃ اخل ثیابھا وتنکرت وحفت بھا اماؤھا۔

ظاہر ہے کہ اہلبیت بہت بیش قیمت کپڑے کبھی بھی نہیں پہنتے تھے مگر اس موقع پر جناب زینبؑ نے وہ عام کپڑے کہ جیسے آپ پہنا کرتی تھیں انکو بھی نہیں پہنا تھا بلکہ بہت پست اور معمولی درجہ کے کپڑے آپنے پہنے تھے اور لباس میں بالکل تبدیلیا

یعنی اگر فساد فی الارض کا الزام لگایا جانے لگے تو اسے دفع کر دے۔ اگر دین سے انحراف ثابت کیا جانے لگے تو اسے رد کر دے۔

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بہت سے واقعات پر دنیا حیران ہوتی ہے اور ان کا راز انسان کی سمجھ میں نہیں آتا ہے خصوصاً بڑے لوگوں کے افعال اکثر ایسے ہوتے ہیں اگر عام افراد کے دماغ ان مصلحت کی تہ تک ہمیشہ پہونچ جایا کریں تو بڑے لوگ بڑے اور چھوٹے کیسے سمجھے جائیں۔

دنیا حیران ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جیسا اتنا بڑا مقصد حاصل کرنا ہو جو حسینؑ کے پیش نظر تھا یعنی جسے مادی طاقت کو ہمیشہ کے لئے پامال بنانا ہو اور روحانی طاقت کو قائم کرنا ہو وہ اپنے ساتھ ایسے افراد کو لیکر آئے جن کو آسے محل تک بھی لانا چاہیئے یعنی عورتیں اور بچے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ مسلک مشتبہ ہو جاتا اور نوعیت شہادت بدلجاتی اگر اہل حرم کا ساتھ نہ ہوتا۔

آپ نے دیکھا کہ امام حسنؑ زہر سے شہید کئے گئے مگر اس وقت تک یہ مسئلہ مشتبہ ہے پھر کربلا کے بے آب و گیاہ میدان میں ستر بہتر آدمی جو قتل ہو جاتے کوئی بتانے والا کہاں ہوتا کہ ان کا مسلک اور طرز عمل کیا تھا۔

اب تو قاتل افراد کی زبانیں ہوتیں اور مقتولین کے جرائم کی فہرست اور ادھر سے کوئی جواب دینے والا ہی نہ ہوتا۔

بہر حال صورت حال ایسی ہی تھی میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ایک

بڑی سیاسی غلطی تھی اہلبیت کو یوں لیجانا ایک جگہ سے دوسری جگہ۔ یہ صرف جذبات نفسی اور مادی فتح کے نشہ میں کام ہوا ہے اور اس کا مظاہرہ کیا گیا ہے لیکن سیاست کے اعتبار سے یہ بہت بڑی غلطی تھی کیونکہ اس طرح درحقیقت حسینؑ کی خاموش زبان کو گویا کر دیا۔ ورنہ اہلبیت حسینؑ لاکھ چاہتے اُن کو نشر و اشاعت کا موقع کہاں ملتا مگر دشمن خود ذریعہ بن گئے اس مقصد میں کامیابی کا آپ ملاحظہ کیجئے کہ وہ مقامات، وہ جگہیں جہاں اہتمام کیا گیا تھا اس کے پہلے حق کی پردہ داری کا وہاں واقعات کا انکشاف کس طرح ہوا۔ اگر ہوتا جو کچھ کیا گیا تو یہ نتیجہ کیونکر برآمد ہوتا۔ ان مقامات پر ظالم اور مظلوم کا نقشہ کیونکر پیش ہوتا۔

وہ سب سے پہلا مرقع عبرت۔ ابن زیاد کا دربار۔ بیشک وہ حکم اسلامی جو عورت کیلئے پردہ کے متعلق ہے رہنمائے اسلام کے ذمہ دار افراد بہر حال جہانتک اپنے سے متعلق ہے اپنے طرز عمل سے غالباً یہ خود انکو اس کا اہتمام ہر وقت مدنظر تھا اسلئے یہاں یہ ہے کہ لبستہ زینب بنت فاطمہ ارذل ثیابھا وتنکرت وحفت بھا اماؤھا۔

ظاہر ہے کہ اہلبیت بہت بیش قیمت کپڑے کبھی بھی نہیں پہنتے تھے مگر اس موقع پر جناب زینب نے وہ عام کپڑے کہ جیسا آپ پہنا کرتی تھیں اُنکو بھی نہیں پہنا تھا بلکہ بہت پست اور معمولی درجہ کے کپڑے آپنے پہنے تھے اور لباس میں بالکل تبدیلی

یعنی اگر فساد فی الارض کا الزام لگایا جانے لگے تو اُسے دفع کر دے۔ اگر دین سے انحراف ثابت کیا جانے لگے تو اُسے رد کر دے۔
میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بہت سے واقعات پر دنیا حیران ہوتی ہے اور اُن کا رمز انسان کی سمجھ میں نہیں آتا ہے خصوصًا بڑے لوگوں کے افعال اکثر ایسے ہوتے ہیں اگر عام افراد کے دماغ ان مصلحت کی تہ تک ہمیشہ پہنچ جایا کریں تو بڑے لوگ بڑے اور چھوٹے چھوٹے کیسے سمجھے جائیں۔
دنیا حیران ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جسے اتنا بڑا مقصد حاصل کرنا ہو جو حسینؑ کے پیش نظر تھا یعنی جسے مادی طاقت کو ہمیشہ کے لئے پامال بنانا ہو اور روحانی طاقت کو قائم کرنا ہو وہ اپنے ساتھ ایسے افراد کو لیکر آئے جن کو اس محل پر نہیں لانا چاہیئے یعنی عورتیں اور بچے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ مسلک مشتبہ ہو جاتا اور نوعیت شہادت بدل جاتی اگر اہل حرم کا ساتھ نہ ہوتا۔
آپنے دیکھا کہ امام حسنؑ زہر سے شہید کئے گئے مگر اس وقت تک یہ مسئلہ مشتبہ ہے پھر کربلا کے بے آب گیاہ میدان میں بہتر آدمی جو قتل ہو جاتے کوئی بتانے والا کہاں ہوتا کہ اُن کا مسلک اور طرز عمل کیا تھا۔
اب تو قاتل افراد کی زبانیں ہوتیں اور مقتولین کے جرائم کی فہرست اور ادھر سے کوئی جواب دینے والا ہی نہ ہوتا۔
بہر حال صورت حال ایسی ہے جس سے تھی میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ایک

اسکے پہلے تک پردے کا خیال تھا مگر اب آگیا اصولِ اسلام کا سوال۔ اس لئے
اب جناب زینب خاموش نہیں رہیں۔ اب اگر خاموش رہیں تو حق پر دھبا آتا ہے۔ ذرا
اقتدارِ نفس دیکھئے عزتِ نفس دیکھئے بلندیٔ نفس ملاحظہ کیجئے عظمتِ نفس کا اندازہ کیجئے یہ جسمانی
پستی ایک چیز ہے اور نفس کا بلند ہونا دوسری چیز۔ یہ تاریخ طبری ہے جس میں لکھا ہے کہ
جناب زینب نے فرمایا۔

الحمد للہ الذی اکرمنا بمحمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم و طہرنا تطہیرا
لا کما تقول انما یفتضح الفاسق و یکذب الفاجر۔

"حمد ہے اس خدا کے لئے جس نے ہم کو عزت دی محمد مصطفےٰؐ کے ساتھ اور خود ہمیں
پاک و پاکیزہ قرار دیا اس طرح جو حق ہے پاکیزہ قرار دینے کا۔ نہ وہ کہ جو تو کہتا ہے" دیکھئے یاد کیجئے
وہ فرعون کی طرف کا الزام موسیٰ پر کہ تم مفسد ہو اور موسیٰ کا اسکے جواب میں یہ کہنے کے بجائے کہ
نہیں مفسد تم ہو ایک اصولی جواب دیا کہ مفسد وہ ہوگا جس کا دعویٰ باطل ہو جائے بالکل
اسی شان سے یزید کا یہ کہنا کہ خدا نے تم کو رسوا کیا اور تمہارا جھوٹ ظاہر کیا۔ اس کا
جواب یہ دیا جاتا کہ رسوا ہو گئے تم اور جھوٹ ظاہر ہوگا تمہارا مگر اس میں بالکل جذبۂ
انتقام ظاہر ہوتا ہے۔ جواب دیا جناب زینب نے اصولی جواب۔ کلیے کے طور پر جواب معلوم
ہوتا ہے مگر در اصل دل کی بھڑاس نکالنا نہیں ہے۔ یہ مردوں کا ذکر نہیں اور عورت کا تذکرہ
ہے جس میں جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔
"رسوا تو وہ ہوتا ہے جو فاسق ہو اور جھوٹ اُس کا ظاہر ہوتا ہے جو فاجر ہو۔

کر لی تھی اور نیزوں نے گرد آپ کے حلقہ باندھ لیا تھا "

یہ ایک عنوان تھا پردہ کا جسے آپ نے اُس وقت اختیار کیا تھا لیکن جب آپ آگر بیٹھیں تو عبید اللہ بن زیاد نے کہا یہ بیٹھنے والی عورت کون ہے؟ آپ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ابھی تک پردہ کا خیال ہے۔ تین مرتبہ اُس نے دریافت کیا آخر کسی نے بتلا دیا کہ یہ زینب دختر حضرت فاطمہ ہیں۔ اب ابن زیاد متوجہ ہوا اور کہا الحمد للہ الذی فضحکم وقتلکم واکذب احدوثتکم "شکر ہے خدا کا جس نے تم کو رسوا کیا اور تمہیں قتل کیا۔ اب اسکے بعد وہ چیز ہے جو حق اور باطل کو مشتبہ کرتی ہے وہ یہ فقرہ ہے کہ جھوٹا دکھلا دیا تم لوگوں کا۔ پہلے دو فقروں کے اوپر جناب زینب خاموش رہیں۔ اور اب بھی خاموش رہتیں اسلئے کہ وہ مغرور ابن زیاد کا اپنے طرز عمل پر اظہار مسرت تھا اور موجودہ صورت حال جسے وہ اہلبیت کی رسوائی سے تعبیر کر رہا تھا اس میں شبہہ ہی کیا تھا اور اس پر اُسے خوش ہونیکا موقع بھی حاصل تھا مگر تیسرے فقرہ کے اوپر جناب زینب کو سکوت کرنا روا نہ تھا۔ کذب اور اکذب میں فرق ہے کذب کے معنی ہیں کسی کو جھٹلانا چاہے حقیقتہً وہ سچ ہی کیوں نہ ہو اور اکذب کے معنی ہیں جھوٹ کا دکھلا دینا۔ اُس نے اکذب کی لفظ استعمال کی ہے جس کے معنی یہی ہوئے کہ خدا نے تم لوگوں کی باتوں کا جھوٹ دکھلا دیا۔

"تم لوگوں کی باتیں" یہ فقرہ بڑا وسیع ہے۔ اس میں احادیث، قرآن کے تعلیمات، وحی کے تذکرے سب ہی آجاتے ہیں۔

سزا دیجاتی ہے؟ عورت کی نہ کسی بات کی سزا ہے اور نہ کسی غلطی پر اُسے ملامت کیجا سکتی ہے"۔
مگر ابن زیاد کا دل نہیں مانتا اُسکے دل کو شکست کا احساس ہے جس کی وجہ سے تسکین
نہیں ہوتی۔ پھر اُس نے جناب زینب کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

قد اشفی اللہ نفسی من طاغیتك والعصاۃ المردۃ من اھل بیتك۔
"خدا نے میرے دل کی مراد پوری کردی تمھارے سرکش بھائی اور تمھارے گھرانے کے
دوسرے نافرمان اور باغی اشخاص سے"۔
یہ فساد فی الارض کا الزام ہے۔ طغیان اور سرکشی اور تمرد و عصیاں کا حملہ ہے۔
لیکن استدلالی بات کوئی بھی نہیں دل کو ایک چوٹ لگانا تھی وہ لگی اور جناب زینب کی
آنکھوں سے آنسو نکل آئے مگر انھوں نے جواب دیا۔

لعمری لقد قتلت کھلی وابت اھلی وقطعت فرعی واجتثثت اصلی
فان یشفك ھذا فقد اشتفیت" ہاں بے شک تو نے میرے جوانوں کو قتل
کرڈالا میرے عزیزوں کا خاتمہ کردیا میری شاخوں کو کاٹ ڈالا اور میری جڑ کو کھاڑ کر
پھینک دیا اگر تیری مراد اس سے بر آگئی ہے تو بے شک اس سے خوش ہولے"۔
شکست اور پھر شکست۔ ابن زیاد نے کہا ھذہ سجاعۃ قد لعمری کان ابوك
شاعرا سجاعا یہ بڑی قافیہ باز عورت ہے اور تمھارے باپ بھی تو زینب شاعر اور قافیہ باز تھے
یہ فصاحت و بلاغت کا اعتراف ہے جو اس صورت میں کیا جا رہا ہے۔ جناب زینب نے
پھر سکوت نہیں کیا فرمایا۔

اب یہ کوئی بھی ہو"۔

اگر غیرت ہوتی تو ابن زیاد کو منفعل ہونا چاہیئے تھا مگر وہاں اقتدار کا نشہ اور سلطنت کا غرور تھا خواہ مخواہ اُسے جناب زینب کے دل دکھانے کا خیال پیدا ہوا اور کہنے لگا

فکیف رأیت صنع اللہ باھل بیتک "اچھا تم نے دیکھا خدا نے تمہارے گھرانے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا" اس طنزیہ فقرہ کے اثر کو کسی عورت کے دل سے پوچھئے اور اسکے بعد جناب زینب کا اطمینانی جواب دیکھئے۔ فرمایا۔

کتب علیھم القتل فبرزوا الی مضاجعھم وسیجمع اللہ بینک وبینھم فتحاجون الیہ وتخاصمون عندہ۔

"کیا سلوک کیا خدا نے؟ ان کے لئے یہ صورت ہونے والی تھی کہ وہ قتل ہوں اس بنا پر وہ اپنے ابدی خوابگاہوں کی جانب اپنے پیروں سے گئے اور عنقریب خدا تیرا اور انکا سامنا کریگا تو وہاں حجت تمام ہو جائیگی اور یہ مسئلہ طے پا جائیگا"۔

بس شکست کی علامت ہے غصہ آنا۔ دو مناظرہ کرنے والوں میں جبوقت گفتگو کر رہے ہوں ایک کو غصہ آجائے تو سمجھنا چاہیئے شکست خوردہ وہی ہے۔ ابن زیاد کو غصہ آگیا اور غضبناک ہو گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ارادہ کیا جس کی بنا پر عمرو بن حریث نے کہا:- اصلح اللہ الامیر انما ھی امرأۃ وھل تواخذ المرأۃ بشیء من منطقھا انما لا تواخذ بقول ولا تلام علی خطل۔

"امیر یہ عورت ہیں اور کہیں عورت کی بھی بات کی گرفت کیجاتی ہے اور اس کی

الن نبرأھا ۔

مطلب تھا کہ قلیل و نہار عالم امکان میں رہتا ہی ہے۔ کسی کی فتح کسی کی شکست اس کو دلیل حقیقت نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یزید کو فتح کی ترنگ جب اور بڑھی تو وہ دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا۔ دیکھیئے اب مذہبی شان و شوکت کے علاوہ سلطنت و ملکت کے غرور کا مظاہرہ ہے۔ وہ کہتا ہے۔

اتدرون من این اتی ھذا قال ابی علی خیر من ابیہ وامی فاطمۃ خیر من امہ وجدی رسول اللہ خیر من جدہ وانا خیر منہ واحق بھذا الامر منہ۔

"تم لوگ جانتے ہو ان پر یہ مصیبت کیوں آئی؟ حسین کی دلیلیں ہیں اور انکے خصوصیات ہیں جو دشمن کی زبان پر آ رہے ہیں وہ کہتا ہے کہ" ان کا قول تھا کہ میرے باپ (علی) اس کے یعنی یزید کے باپ سے بہتر اور میری ماں اسکی ماں سے بہتر اور میرے نانا اس کے نانا سے بہتر اور میں خود اس سے بہتر ہوں اور خلافت کا اس سے زیادہ مستحق ہوں "۔

اب جواب سنئے: فاما قولہ ابوہ خیر من ابی فقد حاج ابی اباہ وعلم الناس ایھما حکم لہ واما قولہ امی خیر من امہ فلعمری فاطمۃ ابنۃ رسول اللہ خیر من امی واما قولہ جدی خیر من جدہ فلعمری ما احد یومن باللہ والیوم الاخر یری لرسول اللہ فینا عدلا ولا ندا ولکنہ انما اتی من قبل فقھہ ولم یقرأ قل اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع

ما للمرأۃ والسجاعۃ ان لی عن السجاعۃ لشغلا ولکنی نفثی ما اقول۔

بھلا عورت کو قافیہ بندی اور شاعری سے کیا تعلق اور پھر میں تو اس عالم میں ہوں کہ مجھے قافیہ بندی کا ہوش کہاں لیکن ضمیر کی آواز تھی جو میرے دہن سے نکل گئی۔"

یہ ابن زیاد کا دربار تھا۔ اب ذرا موقع کی ہیبت بڑھتی ہے۔ جتنا فرق ابن زیاد اور یزید کی شان و شوکت میں ہے اتنی ہی موقع کے اعتبار سے مادی سطوت و شوکت کی ترقی بھی ہو گئی۔ یہ یزید کا دربار ہے۔ عالم اسلامی کا اس وقت کا شہنشاہ تخت حکومت پر ہے۔ وہاں بھی اسی طرح کی صورت پیش آئی ہے۔ جناب زینب نے اس موقع پر جو تقریر کی ہے اس کا تذکرہ اس محل پر نہیں کرنا چاہتا لیکن یہاں امام زین العابدینؑ سے یزید نے جو گفتگو کی ہے اسے پیش کر کے دکھلانا چاہتا ہوں کہ امام حسینؑ کا تمہید کرنا کن خیالات کے ماتحت تھا۔ الزام یزید کی طرف سے وہی فساد فی الارض کا عائد کیا جا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے

یا علی ابوك الذی قطع رحمی وجھل حقی ونازعنی سلطانی فصنع اللہ بہ ما قد رأیت۔

"اے علی بن الحسین تمھارے باپ نے میری قرابت داری کے رشتہ کو قطع کیا اور میرے حقوق کو نظر انداز کیا اور میری سلطنت میں منازعت کی تو خدا نے اُن کے ساتھ وہ سلوک کیا جو تم دیکھ رہے ہو۔"

امام نے اس کے جواب میں صرف قرآن کی یہ آیت پڑھ دی۔

ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل

ملامت سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ چاہے وہ چنگیز ہو چاہے ہلاکو۔ اور چاہے دنیا کا کوئی اور انتہائی ظالم بادشاہ۔

لیکن کیا یہ واقعی معیار حقیقت ہے، ؟ اور کیا حقیقۃً اس کے آگے صداقت و انصاف اور ضمیر کی جانب سے سر تسلیم خم کیا جا سکتا ہے؟

آپنے دیکھے وہ تمام الزامات جو عائد کئے گئے اور اس طرح مصلح کے اوپر مفسد ہونیکا جرم عائد کیا گیا۔ حسینؑ دین سے خارج ٹھہرائے گئے لیکن فتح کس کی ہوئی اور شکست کس کو نصیب ہوئی۔ اسکے لئے عالم اسلامی کو دیکھ لیجئے۔

ہزاروں اختلاف سہی اور کثیر التعداد فرقے دنیا میں موجود سہی لیکن جہانتک کہ حسین کا تعلق ہے اُن میں افتراق نہیں ہے۔

تاریخی حیثیت سے لوگ یزید کی حمایت کی کوشش کریں کہ قتل حسین میں یزید کی شرکت نہیں تھی یہ اور بات ہے۔ مگر یہ کہ جس نے حسین کو قتل کیا وہ مجرم سب کے نزدیک ہے دنیا کے تمام مسلمان بہر حال اہلبیت کی محبت میں شریک ہیں۔ اہلبیت بنی مخصوص شیعوں کے نبی کے اہلبیت نہیں ہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے نبی کے اہلبیت ہیں اور تمام مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ حسین کے قاتل مجرم ہیں۔ گنہگار ہیں۔ اس بات پر تمام عالم اسلامی متفق ہے۔ اس سے میں کچھ نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت کتنے ہی مسلمانوں کے اندر فرقے ہوں اور دینی اختلافات ہوں لیکن وہ دین فنا ہو گیا جس سے خارج ہونیکا الزام حسین پر تھا اور جس کے پیرو اُن کے قاتل

الملک ممن تشآء وتعز من تشآء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شیئ قدیر۔

وہ اُن کا یہ کہنا کہ میرے باپ اس کے باپ سے بہتر تو یہ تو اس سے ظاہر ہو کہ میرے باپ اور اُن کے باپ کے درمیان جھگڑا ہوا اور دنیا کو معلوم ہے کہ کس کے موافق فیصلہ ہوا ربہ اُس فریب کارانہ سازشی تحکیم کی طرف اشارہ ہو لیکن دنیا کو معلوم ہو کہ اُس کے نتیجہ کو کسی فریق نے بھی تسلیم نہیں کیا اور وہ ایک بازیچہ طفلانہ سے زیادہ وقیع نہیں سمجھا گیا رہ گیا یہ اُن کا کہنا کہ اُنکی ماں میری ماں سے بہتر تو اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ رسول کی بیٹی فاطمہ میری ماں سے بہتر تھیں اور یہ کہنا بھی کہ اُن کے نانا میرے نانا سے بہتر۔ یہ بھی یقینی ہے اسلئے کہ جو شخص خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہو۔ وہ ہرگز رسول کا مدمقابل کسی دوسرے کو نہیں سمجھ سکتا۔ رہ گیا خود اُنکا علمی اور فقہی تبحر وہ بھی بالکل ٹھیک لیکن اسی نے اُن کو یہ روز بد دکھلایا۔ انھوں نے گویا قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی تھی کہ سلطنت کا مالک خدا ہو جسے چاہتا ہے۔ دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھینتا ہے اور جسے چاہتا ہو عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہو۔ اور وہ ہر شے پر قادر ہو۔"

دیکھا آپ نے۔ صفات کی جنگ میں یزید کی شکست اور کھلی ہوئی شکست۔ پھر کیا لیا آخر میں۔ وہی کہ یہ تو سلطنت ہے، جس کے پاس پہونچے بس اُسی کا حق اس دلیل کی بنا پر دنیا کے کسی بادشاہ کو ظالم، ناانصاف اور قابل نفرین و

لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہی چیز جو امن و امان کا ذریعہ تھی اور جس کے ذریعہ سے نظام دنیا کو درست ہونا چاہیئے تھا وہ دنیا میں ایسے فسادات کا پیش خیمہ قرار پائی اور اُس کے ذریعہ سے عالم میں اس طرح انسانیت کو پامال کیا گیا اور اُن تمام صفات کو جو اجتماع بشری کے لئے ضروری تھا اور عام انسانی مفاد کے لئے لازمی تھے ایک ایک کر کے اس طرح مٹایا گیا کہ اب یہ سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ حقیقۃً سلطنت ذریعہ ہے اصلاح عالم کا یا فساد عالم کا۔

بات یہ ہے کہ بادشاہان دنیا کا اُدھر تو دنیا کی مادّی طاقتوں پر قبضہ اور جاہ و حشمت، شان و شوکت کا غلبہ یعنی تمام اُن چیزوں کا جو ایک انسان کے مطالب حاصل کرنیکا ذریعہ ہو سکتی ہیں اُنکے ہاتھ میں ہونا اور پھر اُس پر ہوا و ہوس۔ اغراض شخصی اور مقاصد ذاتی۔ جذبۂ انتقام اور بدنفسی و خصومت اور مقاصد میں کامیابی حاصل ہونے کے ساتھ دل کا بڑھنا اور ولولۂ و ہمت میں اضافہ ہونا۔ کیونکہ انسان جتنا جتنا کامیاب ہوتا ہے اُتنے ہی اُسکے توقعات بڑھتے جاتے ہیں۔ جانے دیجئے اُن بادشاہان عالم کے خیالات کو جو اُن کے ذہن میں گردش کیا کرتے ہیں اسلئے کہ نہ سلطنت ہمارے پاس اور نہ ہم اُن خیالات سے آشنا اسلئے ان تخیلات پر ہم کو حکم لگانے کا حق بھی نہیں لیکن میں اس کا اندازہ دنیا کے اُن چھوٹے چھوٹے اور بالکل مختصر ترین مقاصد کے اعتبار سے عام متوسط درجہ انسانوں کے لحاظ سے کرتا ہوں جو روز مرہ ہمارے سامنے نظر آتے ہیں۔ انسان ہمیشہ اپنی عمر کے محدود ہونے کی بنا پر اپنے مقاصد کو

تھے اور وہی دین باقی ہے جس کے حسینؑ علمبردار تھے۔ وہ دین باقی ہے اور حسینؑ باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے۔

یہ شان ہے حق کے فتح اور باطل کی شکست کی جو ہمیشہ نمایاں رہیگی۔

سلطنت کی طاقت کا فساد فی الارض میں استعمال

سلطنت وحکومت کی بنیاد اصل میں نظام عالم کے درست کرنے پر تھی اس کا مقصد تھا کہ دنیا سے فتنہ و فساد کو مٹا دیا جائے اور امن وامان کو قائم کیا جائے مظلوم اور ظالم میں انصاف و داد خواہی کے حدود مقرر ہوں اور زبردستوں کی زبردستیاں، سرکشوں کی سرکشیاں ختم ہوں۔ ان مقاصد کے لئے حکومت و سلطنت کی بنیاد پڑی ہی۔

چونکہ افراد انسانی معاشرت باہمی میں محتاج تھے اجتماع کے اور اس اجتماع کے لئے ضرورت تھی ایسے قوانین کی جنکے سب پابند ہوں اور ان قوانین کو ضرورت تھی مادی طاقت کی جو انہیں لوگوں سے منوا سکے۔ اسلئے تخیل پیدا ہوا کہ ایک بادشاہ کی ضرورت ہے، جو قانون پر عمل کرا سکے اور دنیا کے نظام کو ایک منظم صورت پر مرتب کر سکے اور چونکہ سلطنت وحکومت کا مفاد تھا اصلاح عالم اور امن وامان کا قائم کرنا۔ اس لئے دنیا کے تمدنی قوانین میں بادشاہ کی مخالفت اور بغاوت امن عامہ کے خلاف سمجھی گئی۔

کے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ گدا ہے اور وہ بادشاہ۔ یہ مزدور ہے اور وہ کروڑپتی انسان لیکن کیفیات وجدانی ونفسانی کے لحاظ سے اُن کی زندگی میں اتنا تفرقہ نہیں ہے۔ جتنا اُن کی ظاہری حیثیتوں میں ہے۔

ایک مزدور کہ جس کو دن بھر کی محنت میں پانچ چھ آنے پیسے ملجایا کرتے ہیں اُسے اتفاق سے راہ چلتے میں ایک روپیہ پڑا ہوا ملجائے جسے وہ اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لے تو میں سچ کہتا ہوں کہ اُسے اتنی ہی مسرت حاصل ہوتی ہے جتنی ایک بادشاہ کو ایک ملک فتح کرنے کے بعد۔ اور یہی انسان، اگر اسے کسی دن پیٹ بھرنے کے لئے مزدوری نہ ملے یا مزدوری کے پیسے اُس کی جیب سے گر پڑیں اور وہ خالی ہاتھ گھر واپس آئے تو اُسے اُتنا ہی غم ہوتا ہے جتنا ایک بادشاہ کو اپنے غنیم کے غلبہ پانے اور ملک کے قبضہ سے نکلجانے سے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس بادشاہ کے لحاظ سے اُس ملک کی نسبت بھی ہے جو اس فقیر کے لئے اس کی محنت و مزدوری کے تھوڑے سے پیسوں کی۔ اور اس لئے اگر اس فقیر کا دل ان پیسوں میں بھرجائے اس طرح کہ پھر اس سے زیادہ کا طالب ہو تو اُس بادشاہ کا دل اُس سلطنت سے بھی بھر سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دیکھنے میں وہ سلطنت ہے لیکن وہ اُسکے لئے عین احتیاج ہے۔ ہم جسے ایک بڑی مملکت سمجھتے ہیں وہ اُس کی آنکھوں میں ایک حقیر شے ہے۔

پیدا کرتا ہے۔ ایک انسان سے پوچھیے کہ تمہاری اس دنیا میں کیا تمنا ہے تو وہ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کی فہرست کو چند باتوں میں ختم کر دیگا لیکن وہی مقاصد اُس کے جب پورے ہو جائینگے تو پھر یہ نہیں ہوگا کہ اب اُسکے مقاصد ختم ہو جائیں اور اُسکے توقعات فنا ہو جائیں۔ بلکہ اب بھی جو پوچھے گا تو وہ کہیگا کہ میری اب یہ آرزو ہے یہانتک کہ وہ لوگ جن کی عمریں کافی ہو جاتی ہیں اُن کو بھی دیکھئے تو یہی سنئے گا کہتے ہوئے کہ دنیا میں بہت کچھ کیا، بہت مقصد حاصل کئے۔ اب کوئی آرزو نہیں ہے۔ بس یہ بات ہو جائے تو پھر دنیا میں ہمارے لئے ہوس نہیں ہے۔ غرض یہ ایک بات کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہیگا اس کو آپ دنیا کے ہر شعبہ میں سمجھ لیجئے۔ طرح طرح کی مسرتیں جو انسان کو حاصل ہوتی ہیں اُن کی یہی کیفیت ہے۔ ایک وقت میں جو چیز نقطۂ آخر مقصد انسانی کا قرار پاتی ہے دوسرے وقت وہی مبدا بنجاتی ہے اُس کے توجہات کیلئے فرض کیجئے کوئی شخص علم کا طالب ہے کوئی شخص دولت کا کوئی نام و نمود کا۔ کوئی جاہ و عزت کا۔ کوئی سلطنت کا طالب ہے اور ہر ایک کے حدود طلب جتنے زیر قدم آتے جاتے ہیں اتنا ہی پائے شوق آگے بڑھتا ہے اور اس طرح یہ نہ سمجھئے کہ ایک بادشاہ سلطنت کا مالک ہو گیا ہے تو اب اس کا دل بھر گیا ہے بلکہ وہ فقیر جو نان شبینہ کا محتاج ہے جتنی طلب اسکو اپنے پیٹ بھر کھانا ملجانیکی ہے اتنی تمنا اس بادشاہ کو ہاں یک ملک ایک صوبہ بلکہ ایک شہر کی ہے جو اسوقت اسکے حدود مملکت سے خارج ہے۔ اسی اعتبار سے میرا قول ہے کہ دنیا میں باعتبار ظاہری حیثیتوں کے اور سامان زندگی کے اگرچہ افراد کے درمیان میں انتہائی تفرقہ پایا جاتا ہے لیکن باعتبار مسرت و کیفیت حیات

طاقتور ایک ہی ہو اور سب کمزور ہوں تو یہ طاقتور سب کو فنا کر دے اور خود ہی برسر اقتدار ہو جائے لیکن نظام عالم میں اکثر طاقتیں لڑتی بھڑتی اور ایک دوسرے سے الگ بھگ ہوتی ہیں اور ہر ایک کے جذبات ہوا و ہوس ایک ہی طرح کے۔ اس طرح پوری دنیا ان مختلف طاقتوں کی کشمکش میں مثل اُس چادر کے ہو جاتی ہے جسے چار قوی ہیکل انسان چاروں طرف سے کھینچ رہے ہوں نتیجۃً یہ چادر چاک ہو گی اور اگر کشمکش جاری رہے تو تار تار ہو جائیگی یہی صورت ہے اس دنیا کی ان طاقتوں کے تصادم میں اور یہی عظیم فساد فی الارض ہے جو دنیاوی سلاطین کے ہاتھوں ہوتا ہے۔

افکار و عقول تلاش کرتے ہیں حل اس مشکل کا، سلطنت کس طرح سے قائم ہو، بادشاہ کس طرح کا ہو تاکہ یہ باتیں نہ ہو سکیں اور یہ زیادتیاں جو ہوا کرتی ہیں۔ اُنکا سد باب ہو لیکن یہ ہو کیونکر جبتک کہ سلطنت کے ذمہ دار افراد میں وہ ہوس وہ جاہ طلبی، وہ شان و شوکت اور قوت و طاقت کے اضافہ کی خواہش باقی ہے جو پست انسانوں کی طبیعت کا تقاضا ہے اُس وقت تک یہ تمام باتیں دور ہو نہیں سکتیں۔

سلطنت کے احکام کو دنیا سے تسلیم کرانے کے لئے طرح طرح کے نظریے بھی عام افراد کے ذہن نشین کئے گئے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ یہ خیال قائم کیا گیا تھا کہ سلطنت درحقیقت بالکل مثل نبوت یا رسالت کے ایک خدا کی طرف سے قرار دادہ چیز ہے اسلئے جب کسی کو اُس نے سلطنت عطا کر دی تو تمام افراد میں سے کسی کو چون و چرا کا حق باقی نہیں رہا اب جو کچھ وہ بادشاہ کرے۔ بہر حال خدا کی مرضی ہے کیونکہ وہ نمایندۂ خدا ہے جو دنیا

بادشاہی جلوس اور اُس کی شان و شوکت ہماری آنکھوں میں بھلی لگتی ہے اور ہمارے دل میں اُس سے خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اُسے صرف آنکھوں سے دیکھکر ہم خوش ہوتے ہیں لیکن جتنی ہمیں اُسے صرف دیکھکر خوشی حاصل ہوتی ہے اتنی بھی اُس بادشاہ کو خود اُس جلوس کے ساتھ نکلنے سے خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اسکے نزدیک ایک معمولی چیز ہے۔ اُس کے دندان حرص و آز اُس پاس کے مالک پر اسی طرح تیز ہوتے ہیں جس طرح ایک گرسنہ انسان جسے پیٹ بھر غذا نہیں ملتی اور اُس کے آس پاس لوگ میٹھے کھانا کھارہے ہیں اور وہ للچائی ہوئی نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھتا ہے۔
اب اگر اس شخص کی طرح وہ بے بس ہے تو خاموشی سے دل پر تکلیف برداشت کر لیگا اور رہ جائیگا لیکن اگر اسکے پاس قوت و طاقت ہے اور مد مقابل کو شکست دینے کا سامان سلطنت ہے اور اُسکے ساتھ مادی ذرائع تو وہ ان ذرائع کو عمل میں لائیگا اس طاقت کو صرف کریگا۔ اور دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریگا۔
اب دوسرا فریق ایک تو ممکن ہے کہ اس کے مقابل میں کمزور ہو ہی نہ اور اس کا کمزور سمجھ لینا اُس کو صرف ایک خیالی غلطی ہو اور دوسرے اگر کمزور بھی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ ہر کمزور خاموشی کے ساتھ اپنے تئیں پامال ہو جانے دے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ مدافعت کریگا اور اس طرح جنگ ہوگی جس کے نتیجہ میں ایک فریق کی فتح اور ایک کی شکست لیکن شکست خوردہ فریق شکست کھانے کے بعد انتقام کی فکر میں لگا رہیگا اور اپنی طاقت بڑھانے کے ساتھ کوشش کریگا کہ اپنے غنیم سے بدلا لے۔ اور پھر اگر دنیا میں

بلکہ کوئی چیز ہی نہیں رہی۔

اسکے بعد دوسری منزل یہ آئی کہ بادشاہ کی برائیوں کا اُسکے غلط فعال و اعمال کا اندازہ ہو مگر مخالفت نہ کی جائے۔ اسکے لئے بھی بادشاہوں کے پاس پورا سامان موجود تھا۔ کیونکہ دنیا خواہشات کی بندہ ہے اور خواہشین دو ہی طرح کی۔ مرغوب طبع باتوں کے حاصل کرنے کی طلب۔ اور ناگوار طبع باتوں سے نجات حاصل کرنے کی کاوش۔ پہلی چیز نتیجۂ رجا اور دوسری نتیجۂ خوف اور رجاء و خوف دونوں کا مرکز مادی اسباب کے حدود میں بادشاہوں کی ذات یعنی اگر کوئی طالب عزت ہے۔ طالب نام و نمود ہے۔ طالب حشمت و اقبال ہے تو ہر ایک کی اُمید بادشاہ ہی سے وابستہ ہے اور قتل کا اندیشہ ہے۔ سولی پانی کا کھٹکا ہے۔ قید و بند کا خطرہ ہے تو یہ سب بھی بادشاہ کی مخالفت میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری کوشش اسبات کی ہوتی کہ کسی طرح بادشاہ راضی رہے۔ وہ خوش رہے اُس کی توجہ مبذول ہو۔ اسطرح اب اگر بادشاہ کے کسی طرز عمل کی برائی کا احساس بھی ہو تو روکے کون اور ٹوکے کون۔ اس طرح بادشاہوں کی مطلق العنانی میں اور اضافہ ہوا اور حصہ رسدی یہ مطلق العنانی بادشاہوں کے متوسلین و مقربین و ارکان دولت میں پیدا ہوئی کیونکہ ان سے بھی حسب مرتبہ و درجہ لوگوں کے اُمید و بیم کی کڑیاں وابستہ ہو گئیں۔ کہیں ناراض ہو کر بادشاہ سے ہماری شکایت نہ کردیں۔ ممکن ہے یہ خوش ہو کر ہمارے لئے کچھ کلمۂ خیر کہدیں۔ اس طرح ان متوسلین و مقربین کے افعال و اعمال بھی نقد و تبصرہ کے حدود سے

میں موجود ہے۔ اسی بنا پر بادشاہ کے لئے "ظل اللہ" کے لقب کی ایجاد کی گئی یعنی جس طرح پرچھائیں ہوتی ہے کہ ہر حرکت و سکون میں جسم کی تابع ہے اسکے افعال کی ترجمان ہے یونہی بادشاہ ہے رحمت و غضب الٰہی کے مظاہرہ کی ایک شان۔

اب بادشاہوں کا طرز عمل نقد و تبصرہ کے حدود سے بالاتر ہوگیا۔ بادشاہ جو کرے وہ ٹھیک ہی ہے۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اس طرح بادشاہ کے احکام میں ایک تعبدی شان قائم کی گئی یعنی وہ حلقہ بگوشی جو مذہب کے خصوصیات میں سے تھی وہ بھی لیکر بادشاہوں کے سپرد کی گئی۔ یہ ایک بڑا افساد ذہنی تھا جس نے رعایا کے قوائے دماغی کو معطل و بیکار بنایا۔ غور و خوض کا حق نہ دیا جانا سمجھنے کا حق سلب کرلینا یہ وہ کامیاب کوشش ہے جس کے بعد مخالفت کا اندیشہ بہت حد تک ختم ہوجاتا ہے اس لئے بادشاہوں کی طرف سے اس کی خاص طور پر کوشش کی گئی۔

اور اسی بنا پر یہ فقرہ ضرب المثل ہوگیا کہ "امور مملکت خویش خسرواں دانند" یہ وہ درجہ ہے جو قرآن نے خداوند عالم کے لئے قرار دیا ہے کا یسئل عما یفعل وھم یسئلون یہی چیز بادشاہ کے لئے تسلیم کرلی گئی اور اس طرح ان کے خلاف لب کشائی کا موقع ہی باقی نہیں رہا۔

اب رعیت دیکھنے لگی بادشاہ کی آنکھوں سے سننے لگی بادشاہ کے کانوں سے اور سمجھنے لگی بادشاہ کے دل سے کیونکہ خود اسکی آنکھ۔ کان اور دل معطل ہوگئے

حکومت کا قائم ہو گیا تو اب فارسی زبان بھولے سے بھی یاد نہیں آتی۔ کسی زمانہ میں عوام کو فارسی میں جتنا ملکہ تھا آتنا اب اہل علم کو بھی نہیں ہے۔

اب کیا ہے؟ اب یہ ہے کہ انگریزی زبان کا ایک حرف نہیں پڑھا ہے مگر گفتگو میں سنے سنائے ہوئے اگرچہ غلط سلط کیوں نہوں، زیادہ سے زیادہ الفاظ انگریزی کے صرف ہوں۔ اسے معیار عزت سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی لباس پہنا جائے۔ اسے سرمایۂ افتخار خیال کیا جاتا ہے۔ انگریزی طرز معاشرت اختیار کیا جائے اسے طرۂ امتیاز قرار دیا جاتا ہے۔

اس میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہ طریق کار مستحسن ہے یا نہیں۔ اس میں کوئی خوبی ہے یا نہیں۔ بس حکومت وقت کے ساتھ تعلق ہے یہی اُس کے استحسان کیلئے کافی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے: الناس علیٰ دین ملوکھم یعنی تمام لوگ اپنے بادشاہ کے مسلک کے اوپر ہوتے ہیں۔

مسیحی دین کو اُسوقت تک دنیا میں کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی جب تک قسطنطین اعظم نے اختیار نہیں کر لیا اور جب اُس نے یہ مذہب اختیار کر لیا تو ملک بھر میں پھیل گیا۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں جب سلطنت نے کسی چیز کو ترقی دی اُسوقت اُس چیز کو مقبولیت حاصل ہوگئی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں ہر انسان کا انفرادی فساد بہرحال انفرادی حیثیت رکھتا ہے لیکن بادشاہ کی حیثیت وہ ہے کہ اُس کے انفرادی فسادات اجتماعی

بالاتر ہو گئے اور خود ان لوگوں کو کوئی فکر اپنے افعال و اعمال کے جائزہ لینے کی نہ رہی
کیونکہ بہر حال وہ جو کچھ کریں گے نہ کوئی اعتراض کریگا نہ اختلاف۔ اسکے ساتھ جمہور
خلائق کو یہ فکر کہ جو افعال و اعمال ان کو پسند ہیں ہمیں بھی اختیار کرنا چاہئیں
چاہے وہ جبر نہ کرتے ہوں ان کاموں پر اور چاہے قانونی حیثیت سے لازم نہ قرار دیں
بلکہ چاہے وہ اپنی زبان سے لوگوں کو دعوت بھی نہ دیں۔ ان افعال کی طرف لیکن
بہر حال بادشاہ کے اختیار کردہ افعال ہونا محرک قوی ہر رعایا کے لئے انہی
کاموں کے اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو مسلک بادشاہ اختیار کرے۔ وہ مسلک
رعیت اختیار کرنے کی کوشش کرے گی۔ جو وضع ولباس بادشاہ کو پسند ہو اُسی
وضع ولباس کو رعیت میں بھی رواج حاصل ہو یہاں تک کہ جس مذہب و عقیدہ کا
بادشاہ پیرو ہے۔ اُس مذہب و عقیدہ کو عام رعیت میں مقبولیت حاصل ہو۔
دیکھ لیجئے کہ جب ہندوستان میں مسلمانوں کا غلبہ ہوا اور سلطنت مسلمانوں کے
ہاتھ میں آئی تو فارسی زبان کو اتنی ترقی ہوئی کہ یہاں کے اصلی باشندوں نے
بھی فارسی میں مہارت حاصل کی اور عام طور پر خطوط فارسی میں لکھے جانے لگے
ہر شخص فارسی میں خط و کتابت کرتا تھا اور کسی اور زبان میں خط و کتابت کرنا
ذلیل نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ کس لئے تھا؟ اسی لئے کہ ارکان سلطنت زیادہ تر
اس زبان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے رعیت کے سب طبقے سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے اس
زبان پر دسترس حاصل کرنا لیکن جب نظام سلطنت میں انقلاب ہوا اور موجودہ نقشہ

علٰحدگی اختیار کرلی ہے۔ آپ نے فرمایا اُسے میرے پاس لے آؤ۔ جب وہ آیا تو حضرت نے فرمایا کہ تم سمجھدار ہو کر شیطان کے راستے پر چل رہے ہو؟! آخر تم اپنے اہل و عیال پر رحم نہیں کرتے۔ خدا نے تمھارے لئے طیبات (جائز لذتوں) کو حلال قرار دیا ہے تو پھر تم کو ان کے استعمال میں خطرہ کس بات کا ہے؟

عاصم کو توجہ پیدا ہوئی خود حضرت کے لباس و غذا کی طرف۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آپ عالم اسلامی کے شہنشاہ ہیں اور خلافت ظاہری کے تخت پر متمکن ہیں۔ اُسکے دماغ میں خیال آیا اور اُس نے کہدیا کہ مجھے تو آپ یہ نصیحت فرما رہے ہیں اور خود آپکے لباس و غذا کا یہ عالم ہے۔

آپ نے فرمایا: ویحك انی لست كانت ان اللّٰه فرض علی ائمة العدل ان يقدّروا انفسهم بضعفة الناس كيلا يتبيغ بالفقير فقره۔

"میری تمھاری برابری نہیں ہے۔ میں اس وقت حاکم کے عہدہ پر ہوں اور عادل حکام کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنا معیار زندگی کمزور ترین افراد رعایا کے مساوی قرار دیں تاکہ فقراء کو اپنی ناداری سے تکلیف نہ محسوس ہو یعنی اُن کے دل میں یہ بات نہ آئے کہ افسوس ہمارے پاس اچھے کپڑے نہیں، اچھا کھانا نہیں۔ جب وہ اپنے بادشاہ کو دیکھیں گے کہ وہ بھی ایسے کپڑے پہنتا ہے۔ ایسی غذا کھاتا ہے تو اُن کے دل کو تسکین ہوگی۔ اب کہاں یہ تعلیم اور کہاں بادشاہان دنیا کا طرز عمل کہ دنیا کی تمام راحتیں وہ چاہتے ہیں سمٹکر صرف اُن کی ذات کے لئے مجتمع ہو جائیں اور دنیا تکلیف میں بسر کرے۔

شکل اختیار کرتے ہیں اور اس طرح اس کی ذاتی بداخلاقیاں فساد فی الارض کا پیش خیمہ قرار پاتی ہیں۔ کیونکہ فساد جیسا کہ میں نے سابق میں کہا ہے شورش ہنگامہ۔ جنگ و جدال ہی نہیں ہے بلکہ فساد فی الارض ہر وہ خرابی ہے جو جمہور میں پیدا ہو۔

اور بادشاہ کا فساد رعیت میں ہر طرح کا فساد پیدا کر سکتا ہے خواہ ذہنی ہو خواہ اخلاقی۔ خواہ تمدنی۔ خواہ اجتماعی۔

اگر وہ ملک گیری کی ہوس نہیں بھی رکھتا اور جنگ و جدال نہیں بھی کرتا مگر خود اپنے افعال میں ذمہ داری کا احساس نہیں کرتا اور برے اخلاق و افعال کو اختیار کرتا ہے تو خود اسکے یہ افعال و عادات ہی خلق خدا میں فساد پھیلانے کے لئے کافی ہیں۔ اسی لئے امیر المومنین نے ارشاد فرمایا۔ اذا تغیر السلطان تغیر الزمان "جب بادشاہ کا رنگ بدلتا ہے تو زمانہ کا رنگ بدل جاتا ہے"۔

اسکے علاوہ یہ کہ بادشاہ کی ذمہ داریاں بہ نسبت دوسرے لوگوں کے زیادہ ہوتی ہیں۔ اس کو آپ نے اپنے قول و عمل دونوں طرح سے ظاہر کیا۔

آپ نے لباس، غذا، ہر طرح اپنی زندگی کو عام مسلمانوں سے زیادہ پابند اور تنگ رکھا۔ حالانکہ اسلام نے ترک دنیا کو ضروری نہیں قرار دیا ہے۔ اس لئے عام افراد جب اس حد تک اپنے نفس کو تکلیف پہنچانے لگیں تو انھیں روکا گیا۔

ملاحظہ کیجئے اس واقعہ کو کہ علا ابن زیاد حارثی نے امیر المومنین سے اپنے بھائی عاصم بن زیاد کی شکایت کی کہ اس نے بالوں کے کپڑے پہن لئے ہیں۔ اور دنیا سے

"مجھے معلوم ہوا کہ تم کو جوانان بصرہ میں سے ایک شخص نے ضیافت میں مدعو کیا اور تم وہاں بڑی تیزی سے پہونچ گئے تمھارے لئے رنگ رنگ کے اچھے کھانے منتخب کر کے لائے جا رہے تھے اور پیالے تمھاری طرف بڑھائے جا رہے تھے"

یہ تصویر کشی ہے اُس حالت کی کہ جب کوئی بڑا آدمی کسی دعوت میں آجاتا ہے بس کچھ نہ پوچھئے اب میزبان اپنے سب مہمانوں کو بھول جاتا ہے اور ہمہ تن اسی ایک کی خدمت میں مصروف ہو جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ اسی انسان کو بھوک ہے۔ ممکن ہے میں بھی جب کہیں جاتا ہوں تو میرے لئے بھی یہ ہوتا ہو۔ لیکن یہ مجھے اظہار حقیقت سے مانع نہیں ہو سکتا۔

صورت حال اسوقت یہ بالکل یہ ہوتی ہے کہ یہ مہمان ایک پیالہ سے زیادہ کو استعمال میں نہیں لائیگا اور نہ اُس کے سیر ہونے کے لئے اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ مگر گرما گرم لبالب پیالے اُس کے آگے بڑھائے جا رہے ہونگے حضور اس میں سے نوش فرمائیں۔ یہ پیالہ حاضر ہے۔ اس میں سے تناول فرمائیے۔

خود اُسوقت کی حالت بتا رہی ہے کہ یہ انسان ان تمام مہمانوں میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے اور بڑا آدمی ہے۔ ظاہر ہے کہ شہر کا حاکم جب کسی دعوت میں آجائیگا تو اُسکے لئے یہ صورت اپنی اعلیٰ شان پر نمودار ہوگی۔ اسی کو امیر المومنینؑ نے بیان فرمایا ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

وما ظننت انک تجیب الی طعام قوم عائلھم مجفو وغنیھم مدعو۔

یقیناً بادشاہ کی ذات نمونۂ عمل ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اِدھر کوئی تختِ سلطنت پر متمکن ہوا اور دنیا کی نظریں اُدھر لگ گئیں کہ اُس کے افعال کیا ہیں، اُسکے عادات کیا ہیں۔ اُس کا طرزِ معاشرت کیا ہے۔

اسی بنا پر امیرالمومنین اپنے عمال حکومت یعنی مختلف شہروں کے گورنروں کی بھی سختی سے نگرانی فرماتے تھے اور ایسی ایسی باتوں پر انھیں تنبیہ کرتے تھے جو عام افراد کے لئے اس حد تک قابلِ اعتراض بھی نہیں ہیں۔

عثمان بن حنیف انصاری آپ کی طرف سے بصرہ کے حاکم تھے۔ انھیں کسی نے ضیافت میں مدعو کیا اور وہ اُس دعوت میں جا کر شریک ہوئے۔ بس یہ خبر تھی جو امیرالمومنینؑ کو پہونچی۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر کوئی اور ہوتا جو ذمہ دارانہ حیثیت نہ رکھتا تو یہ بات بالکل توجہ کے قابل بھی نہ تھی کیونکہ اس میں کوئی خلافِ شرع امر نہ تھا اور نہ کوئی گناہ تھا۔ وہ پُر تکلف دعوت سہی لیکن پُر تکلف دعوت میں جانا اور لذیذ کھانے کا کھانا بھی تو حرام نہیں ہے۔

مگر چونکہ عثمان بن حنیف کو حکومت کا منصب حاصل تھا اس لئے امیرالمومنینؑ نے تنبیہ کی ضرورت محسوس فرمائی اور خط لکھا۔

اما بعد یا ابن حنیف فقد بلغنی ان رجلا من فتیۃ اہل البصرۃ دعاک الی مأدبۃ فاسرعت الیہا تستطاب لک الالوان وتنقل الیک الجفان

نہ ملیگا اس لئے کسی غریب کو خصوصاً اگر وہ شریف اور باعزت انسان ہو کیا ضرورت کہ وہ اس ذلت کو برداشت کرے۔

اگر کسی نے اپنی غیرت کو خیرباد کہکے اس ننگ کو گوارا بھی کیا تو دھکے دیکر نکال دیا گیا اور بیچارے کو واپس جانا پڑا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس دعوت ولیمہ سے وہ مقصد کیونکر پورا ہوا۔ اگر نیت ہوتی خلق خدا کو فائدہ پہونچانے کی تو بھوکوں کو بلایا جاتا۔ پیٹ بھروں کے بلانے کی فکر نہ کی جاتی مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ہوتا وہی ہے جو میں نے پہلے بیان کیا۔

روزہ خدا کی ایک عبادت ہو مگر اس میں شارع نے اپنی جانب سے حقوق الناس کو شریک کر دیا۔ افطار صوم کو فضیلت دی یعنی بہت بڑی عبادت اسے قرار دیا کہ کسی روزہ دار کا روزہ کھلوا دیا جائے۔ اس حکم کے اوپر عمل بھی اسی صورت سے کیا گیا کہ اُسے اپنے میل جول اور تعلقات کا ذریعہ قرار دے لیا جیسے بے تکلف دوستوں میں آپس میں دعوتیں ہوا کرتی ہیں ویسے ہی افطار صوم کی رسم میں تبادلہ ہونے لگا اور اسلئے ایک رئیس اپنے درجہ کے رئیس ہی کا روزہ کھلوائیگا۔ ایسی ہی دوسری چیزیں ہیں جن کی بنیاد فائدہ رسانی خلائق پر تھی مگر اپنے طرز عمل کی وجہ سے وہ مقاصد فوت ہو گئے۔

مجلس کا حصہ اس کی بھی بنیاد درحقیقت یہی تھی کہ کمزور اور محتاج افراد کی اعانت ہو۔ افراد قوم میں کتنے وہ ہیں جن کو پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ ان کو جب معلوم ہوتا ہو کہ فلاں جگہ روٹیوں کی مجلس ہو یا پلاؤ تقسیم ہوگا تو

"مجھے تم سے یہ اُمید نہیں تھی کہ تم ایسے لوگوں کی دعوت میں جاؤ جہاں عیال دار غریبوں کو تو نظر انداز کیا جائے اور مالدار لوگوں کی دعوت دی جائے"۔

یہ بالکل نقشہ ہے اُن ضیافتوں کا جو ارباب دنیا کی طرف سے کی جاتی ہیں۔ یعنی وہ چیزیں جنھیں ذریعہ قرار دیا گیا تھا تعاون باہمی کا، فائدہ رسانی خلق کا اُن کو ذریعہ قرار دے لیا گیا صرف اظہار نام و نمود کا۔ مثلاً شادی میں دعوت ولیمہ کی رسم، اس کی بنیاد یہ تھی کہ تم نے اگر اپنے گھر میں ایک مسرت کی تقریب قرار دی ہے اور تمھارا دل خوش ہوا ہے تو تم دوسرے لوگوں کو کیوں بھلاؤ۔ اُن کے لئے اتنا ہی سہی کہ ایک وقت کا کھانا کھلا دو حقیقتاً یہ اُن غریبوں کے مفاد کے لئے ہے جن کے واسطے ایک وقت کا کھانا بھی ایک قابل قدر اور غیر معمولی نعمت ہے۔ مگر ہمارے یہاں دعوت ولیمہ صرف اپنے تعلقات کے مظاہرہ کا ذریعہ قرار پائی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اگر کسی رئیس کے یہاں ولیمہ ہے تو مخصوص طور سے کارڈ چھپوائے گئے وہ کارڈ مخصوص لوگوں کے پاس بھیجے گئے جن کے نام ان رئیس صاحب کو معلوم ہیں اور بھلا ایسے رئیس صاحب کو غریبوں کے نام کیوں معلوم ہونے لگے۔ اور اگر معلوم بھی ہوں تو ضرورت کیا ہے کہ اپنی سفید پوش محفل کو میلا اور بدنما بنایا جائے بھیجے گئے کارڈ اُن لوگوں کو جو ایسے بہت سے دقت کے کھانوں کو بھی کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ کسی غریب کو شرکت کرنے کی کیا مجال۔ کیونکہ ایک آدمی دروازہ پہ کھڑا ہے اور وہ ہر آنے والے سے اُس کا کارڈ مانگتا ہے اور دیکھ لیتا ہے۔ اگر کارڈ نہ ہوگا تو اندر جانا

امر خیر ہے مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر حصہ تقسیم ہوتا تو دو سو روپے صرف ہوتے۔ یہاں پچاس روپے یتیم خانہ بھیج دئے گئے اور مجلس کے رقعوں میں نیچے لکھ دیا کہ "تقسیم حصص کی رقم نذر شیعہ یتیم خانہ کی گئی" حاصل کیا ہوا؟ وہی نام و نمود۔ جب سستے داموں میں نام اچھا ہو کام الگ نکلے تو ضرورت کیا کہ زیادہ رقم صرف کی جائے۔ جو روپیہ بچا وہ ان دنیاوی فضولخرچیوں میں صرف ہوا جن میں اس طرح کے ارباب دنیا کا روپیہ عموماً صرف ہوتا رہتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ بہت سے مصلحین قوم ایسی تجاویز پیش کرتے ہیں جو بجائے خود بالکل ٹھیک ہیں مگر عملی پہلو ان کا تاریک ہے۔ بات سیدھی سادھی بڑی ٹھکانے کی ہے کہ جو رقم حصوں میں صرف ہوتی ہے وہ کسی قومی کام میں اور تعمیر ملی میں صرف کی جائے مگر مجھے کون اطمینان دلائے کہ وہ حصہ کی رقم اسی صورت سے خیر خیرات میں صرف ہوگی جس صورت سے وہ لائحہ عمل میں پیش کی جا رہی ہے۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ وہ رقم جب اس طرف سے پس انداز ہوئی تو سنیما اور تھیٹروں میں صرف ہونے لگی یا اگر قدامت ہی قدامت ہے تو کنکوے بازی بٹیر بازی مرغ بازی وغیرہ وغیرہ لیکن ان کاموں میں صرف نہ کی گئی جن کے لئے مصلحین قوم نے حصص کی رسم کو ملتوی کیا تھا۔

اس صورت میں تو میں بہتر یہی سمجھتا ہوں کہ حصص کی رسم قائم رہے۔ اس صورت میں جو کچھ صرف ہوتا ہے وہ بہر حال ایک بھائی کے کام و شکم کی پرورش کرتا ہے۔ یہی سہی لیکن آپ نے نزدیک جو پس انداز کرنے کی صورت بتائی ہے اس میں پس انداز کا م

یہ لوگ سب اس مجلس میں آکر اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نہ معلوم کتنے لوگ وہ ہیں جنکی دو چار دن پرورش ہی حصوں پر ہوتی ہے لیکن وہ آنے والے اکثر اُن میں سے پھٹے ہوئے لباسوں میں ہوتے ہیں۔ شرفا اور سفید پوش لوگوں کو اس کا احساس ہوا۔ ایسی مجلسوں میں جانے سے گھبرانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رؤسا نے حصے گھروں پر تقسیم کرنا شروع کئے لیکن اب یہ حصے تو انہی لوگوں کے گھروں پر جائینگے جن کو اس قابل سمجھا جائیگا۔ بھلا وہ غربا جن کے سلام کا جواب دینے میں ان رئیسوں کو عذر ہوتا ہے انکے گھروں پر یہ حصہ کیوں جانے لگا۔ اسکے معنی یہ ہوئے کہ وہ حصہ جو تبرک سمجھا جاتا تھا اور جس کی بنا پر غریبوں کی طبیعت پر کوئی احسان مندی کا بار نہیں پڑتا تھا اب اس تبرک کو محدود قرار دیا گیا گھروں کے ساتھ۔

لہذا وہ خود دار انسان جو محتاج تھے مگر اپنی عزت کو محفوظ کئے ہوئے تھے اُن کو اپنے گھر پر حصے کے نہ آنے کا قلق ہوا اور اس کے ساتھ وہ مجلس میں جانا اپنی توہین کا باعث سمجھے اور وہ غربا جو مجلس میں پہونچ گئے انھیں بہرحال اُس حصہ سے محرومی ہی رہی جو اس مجلس میں تقسیم ہونے کی صورت میں ان غریبوں کی پرورش کا ذریعہ تھا۔ اس صورت سے مفاد حصہ کا رخصت ہو گیا اور کوئی نتیجہ اس کا سوائے اظہار نام و نمود کے باقی نہیں رہا۔

اس کے بعد مصلحین قوم نے یہ کہنا شروع کیا کہ حصوں کی رقم بجائے حصوں میں صرف کرنے کے یتیم خانہ بھیجدی جائے یا اور اسی طرح کے ادارہ میں دیدیجئے۔ خیر یہ بھی

سونگھنے کی زحمت بھی برداشت نہ کریں گے کہ یہ کہاں سے آیا ہے اور جائز ہے یا ناجائز۔
یقیناً ایک ذمہ دار انسان کے یہ طرز عمل شایان شان نہیں ہے عثمان بن حنیف حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے اُن کو ایسی باتوں پر بھی نظر رکھنا امیر المومنینؑ کے مذاق اصلاح پروری میں ضروری تھا۔

ابتک خود عثمان بن حنیف کو بحیثیت حاکم دوسروں کے لئے نمونۂ عمل بننے کی تاکید تھی لیکن اب امام نے ضرورت محسوس کی کہ خود عثمان بن حنیف کو بھی تو ایک نمونۂ عمل کی طرف توجہ دلادی جائے جو اُن کے لئے مرکز پیروی قرار پا سکے اسلئے ارشاد فرماتے ہیں

الاوان لکل ماموم اماما یقتدی بہ ویستضیئ بنور علمہ الاوان امامکم قد اکتفی من دنیاہ بطمریہ ومن طعمہ بقرصیہ۔

"معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر انسان کے لئے ایک پیشوا ہوتا ہے جس کی وہ پیروی کرتا ہے اور اسکی دانائی کے نور وضیاء سے فیض حاصل کرتا ہے بھئیں اگر اپنے امام علی بن ابیطالب کو دیکھنا ہو تو دیکھ لو کہ میں نے مال دنیا سے صرف دو کہنہ و بوسیدہ کپڑوں پر اور کھانے کی چیزوں سے صرف دو سوکھی روٹیوں پر اکتفا کی ہے"۔

الاوانکم لاتقدرون علی ذالک ولکن اعینونی بورع و اجتھاد وعفۃ وسداد۔

"ہاں مگر تم اتنا نہیں کر سکتے ہو۔ اسلئے میں یہ نہیں کہتا کہ تم بالکل یہی کرو جو میں کرتا ہوں مگر جہاں تک ہو سکے میرا ساتھ دو پرہیزگاری اور تقویٰ اور

وہ غیر اقوام کی تماشا گاہوں کی نذر ہو جائیگا۔ پہلے بس انداز کرنا سیکھئے اور دوسروں کو سکھایئے پھر اس طرح کی تحریکیں پیش فرمایئے۔ ابھی تک تو ہمیں بس انداز کرنے کا طریقہ ہی نہیں معلوم۔

بہر حال یہی چیز جو دعوتوں میں عام طور پر نظر آتی ہے کہ رئیسوں کو دعوت دیجاتی ہی اور غریبوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے امیر المومنین نے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے کہ عائلھم مجفوو غنیھم مدعو۔

آپ کا مطلب یہ ہو کہ عثمان بن حنیف کو متنبہ کردیں۔ اگر وہ بحیثیت حاکم میزبان کو ایک ادنی سی تنبیہ کر دیتے کہ میں ایسی دعوت میں شریک ہونا پسند نہیں کرتا جہاں غربا کو دعوت دینے سے گریز کیا گیا ہو تو پھر غربا کو دعوتوں میں اس طرح نظر انداز نہ کیا جا سکتا اسکے بعد آپ دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

فانظر الی ما تقضمہ من ھذا المقضم فما اشتبہ علیک علمہ فالفظہ وما ایقنت بطیب وجوھہ فنل منہ یعنی یہ بھی تو دیکھ لیا کرو کہ جو کھانا تمھیں کھلایا جارہا ہو وہ کیسا ہو۔ اگر کچھ تمھیں شبہہ پیدا ہو تو اُسے چھوڑ دو اور اگر یقین ہو کہ حلال کمائی کا کھانا ہے تو اُسے تناول کرو“۔

مگر دنیا میں یہ حالت ہو کہ یوں ہم اپنے مقام پر کسی شخص کو ممکن ہے الزام بھی دیتے ہوں اور کہتے ہوں کہ وہ مال حرام صرف کرتا ہی اور حرام کا روپیہ کھاتا ہی لیکن اگر وہ ہم کو کبھی دعوت میں مدعو کرلے یا کچھ نذرانہ ہماری خدمت میں پیش کردے تو پھر ہم یہ

اور تیرے گرد و پیش ایسے گلیجے ہوں جو چمڑا تک اگر ملے تو اس کے کھانے کے لیے تڑپ جائیں"۔

اسے حاکمانہ حیثیت کی ذمہ داری کا اظہار۔

۳۔ اقنع من نفسی بان یقال امیر المومنین ولا اشارکھم فی مکارہ الدھر واکون اسوۃ لھم فی جشوبۃ العیش۔

"کیا میں اتنے پر اکتفا کر لوں کہ لوگ مجھے امیر المومنین (مسلمانوں کا حاکم) کہتے ہیں اور میں ان مسلمانوں کے ساتھ زمانہ کی سختیوں میں حصہ نہ لوں یا زندگی کی ناخوشگواری میں اُن کے لیے نمونہ نہ بنوں"۔

دیکھیے کیا اس سے پورا اندازہ نہیں ہوتا کہ امیر المومنینؑ کی نگاہ میں ایک بادشاہ اور صحیح حاکم کے فرائض کا معیار کتنا سخت ہے یقینی بادشاہ اگر اعتدال پر قائم رہے تو دنیا اعتدال پر قائم رہے گی اور اگر بادشاہ نے خود بداخلاقیاں اختیار کیں اور فساد کے راستہ پر گامزن ہوا تو یقیناً رعایا میں بھی فساد ہوگا اور یہ فساد فی الارض وہ ہے جو بادشاہ کے انفرادی افعال کا نتیجہ ہے اور جس سے دنیا کے اصلاحی مقاصد کو عظیم صدمہ پہونچتا ہے۔

یہ تو بادشاہوں کے انفرادی افعال تھے۔ اسکے بعد وہ ہوس ملک گیری، وہ تخت و تاج کی آتش طلب جو کسی طرح سے بجھتی نہیں، کسی طرح سے خاموش نہیں ہوتی وہ دنیا کے امن و امان کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

قرآن میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا

پارسائی اور سلامت روی کے ساتھ ۔

آخر میں آپ نے اپنی حاکمانہ حیثیت کے ساتھ ذمہ داری کے اضافہ اور اپنی مواسات خلائق اور ہمدردی کے احساسات کو ظاہر کرنے کے ساتھ شروع میں اغنیاء زمانہ کے غرور اقتدار کو ایک بڑی ٹھوکر لگائی ہے یہ فرما کر ۔

ولو شئت لاهتديت الطريق الى مصفّى هذا العسل ولباب هذا القمح ونسائج هذا القز ولكن هيهات ان يغلبني هواي ويقودني جشعي الى تخير الاطعمة ولعل بالحجاز واليمامة من لا طمع له في القرص ولا عهد له بالشبع ۔

"اگر میں چاہتا تو مجھے بھی ذرائع حاصل تھے کہ (کھانے کے لئے) صاف اور شفاف شہد اور بہترین خالص اناج اور پہننے کے لئے ریشم کے کپڑے میرے لئے موجود ہو جاتے لیکن حاشا وکلا اس بات سے کہ میری خواہشیں میرے اوپر غلبہ پائیں اور میری حرص مجھ کو لذیذ غذاؤں کے انتخاب پر آمادہ کرے حالانکہ شاید حجاز یا یمامہ میں ایسے اشخاص موجود ہوں جنھیں ایک روٹی کی بھی توقع نہیں اور سیر ہو کے کھانے کا مزہ تک معلوم نہیں ۔

او ابيت مبطانا وحولي بطون غرثى ، واكباد حرّى او اكون كما قال القائل

وحسبك داء ان تبيت ببطنة وحولك اكباد تحن الى القد

"کیا میں شکم سیر ہو کر سو رہوں اس حالت میں کہ میرے گرد وپیش گرسنہ شکم اور تپتے ہوئے کلیجے موجود ہیں اور میری وہ ہائی ہو جسے شاعر نے کہا ہے کہ

اس سے بڑھ کے تیرا روگ کوئی نہیں ہو سکتا کہ تو تخمہ میں مبتلا ہو کر دنیا سے سدھارے

رعیت کے دکھ درد کا حکومت کی طرف سے احساس کیا جا سکا اس لئے نمائندے منتخب کئے ہوئے جمہور کے ہونگے وہ سمجھیں گے کہ ہمارے بھیجے ہوئے گئے ہیں۔ اس لئے ہمارے ضروریات کا لحاظ کرینگے اور ہمارے مصائب کا اُنھیں خیال ہوگا۔

دنیا سمجھی کہ اب اُن استبدادی الآم و شدائد سے نجات ملگئی لیکن دنیا کے واقعات روزانہ ہونے والے حوادث تبلاتے ہیں کہ یہ نظام بھی نوع انسان کے لئے فائدہ مند ثابت نہوا۔

اس طرح سے بھی بے دست و پا افراد پر مظالم کا خاتمہ نہیں ہوا۔ طاقت و شہرت و وجاہت رکھنے والے صاحبان نام و نمود اور صاحب شخصیت افراد تو پہلے بھی ایک حد تک صرف اپنے اعزاز و وجاہت، ثروت و دولت کی بنا پر محفوظ رہ سکتے تھے اور رہتے تھے۔ وہ اب بھی محفوظ ہیں اور یہ طبقہ بہر حال زندگی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن وہ کمزور افراد جو حقیقتہً مراعات کے مستحق تھے جن کے ضروریات حقیقتہً سمجھنے کے قابل تھے اور درحقیقت جن کی اکثریت سے اس جمہور کی تشکیل ہوتی ہے اور جن کی زیادہ تعداد اس پوری طاقت و قوت ملکی کے لئے ذرات حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کے ضروریات پہلے بھی نظر انداز ہوتے تھے اور اب بھی دل بہلانے کے لئے اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ایک مفہوم ہے جسے "جمہوریت" کہتے ہیں اور خیال ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر تمام لوگوں کے منافع اور مصالح کا لحاظ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہانتک کہ بہت سے وہ لوگ جو مذہب کے تعلیمات کے علمبردار ہیں وہ اس معاملہ کو مذہبی لباس پہنا کر بھی

وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذلک یفعلون۔

"بادشاہ جب کہیں وارد ہوتے ہیں وہاں فساد پیدا کر دیتے ہیں اور عزت دار لوگوں کو وہاں کے ذلیل کر دیتے ہیں۔ اُن کا عام طرز عمل یہی ہوتا ہے"۔

دنیا کے سلاطین بہت کم وہ ہیں جو اس سے مستثنیٰ ہوں۔ تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ انکے فسادات کی فہرست جو دنیا میں برپا ہوئے ہیں طویل ہے۔ تاریخ قدیم اور تاریخ جدید۔ ماقبل اسلام اور مابعد اسلام ہر زمانہ میں بادشاہوں کے تاریک کارناموں سے اوراق تاریخ کے سیاہ پڑے ہوئے ہیں۔ ہر دور میں افراد انسان اس جماعت کے ہاتھوں پریشان ہوتے رہے ہیں اور اخلاق جمیلہ ان کے ہاتھوں پامال ہوتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ بادشاہ کی حیثیت ایک مالک کی قرار دے لی گئی اور رعیت کے افراد کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا رہا جو غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا جس وقت میں بادشاہ شخصی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ سلطنت کے معنی یہی تھے کہ ایک شخص تمام رعیت کے نظام کا ذمہ دار ہو۔ چاہے سیاہ کرے۔ چاہے سفید۔ دنیا اُن مصائب سے گھبرائی اُن تکلیفوں سے پریشان ہوئی جو اس قسم کے بادشاہوں کے ہاتھوں رونما ہوئے۔ آخر اس کا حل تجویز کیا اور سمجھے کہ اب کامیاب ہو گئے۔ وہ حل یہ تھا کہ بادشاہ شخص واحد نہ ہو بلکہ ایک نظام جمہوری قائم ہو اور اسکے تحت میں حکومت ہو۔

اس طرح سلطنت کا مفاد حاصل ہوگا اور شخصی استبداد کی تکالیف سے نجات رہیگی۔

جرأت بھی ان میں ہوتی کہ جو کچھ اُن کا دماغ بتاتا ہے اُس پر وہ قائم رہیں اور جسے مفید سمجھیں اُسی کے لئے رائے دیں اور ہرگز خارجی اثرات اور بڑی شخصیتوں کے اقتدار وغیرہ سے مرعوب نہوں اور وقتی خوشامد اور چاپلوسیوں سے متاثر ہوں نہ کسی طرح کے تعصب اور ذاتی و قومی عناد کا اثر لیں اگر افراد جمہور عموماً ان خصوصیات کے حامل ہو سکتے تو بیشک ان آرا کی اکثریت سے جو نظام طیار ہوتا وہ جمہور کے تمام طبقات کے لئے ضرور مفید ہی ثابت ہوتا لیکن جبتک کہ اس دنیا میں دو طبقے موجود ہیں ایک طبقہ خواص کا ہے اور ایک طبقہ عوام کا جس کی اکثریت ہے۔ مگر یہ اکثریت پوری بسبب اپنے دائمی افلاس اور ذہنی بے مائیگی اور اخلاقی کمزوری اور نفس کے چھوٹے پن کے اُسی خواص کی جماعت کی مٹھی کے اندر ہے اور اُنہی کے آلۂ کار ہے اور خواص خود ہوا و ہوس اور ذاتی خودغرضیوں اور باہمی رقابتوں کا شکار ہیں اور ہمیشہ ہر چیز کو انہی اغراض کے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ جبتک یہ صورت قائم ہے اُس وقت تک اُس صحیح جمہوریت کی تشکیل ہی نہیں ہو سکتی جو عامۂ خلائق کے لئے یکساں حیثیت سے مفید ہو سکے۔
ہوتا کیا ہے؟ ایک امیر کبیر رئیس۔ راجہ مہاراجہ کو اپنے سے موافق بنا لیجئے بس پھر جتنے اُس کے متوسل اور وابستۂ دامن ہیں وہ سب ہی آپ کے ہو گئے غیر ممکن ہے ایک رائے بھی اُن میں سے آپ کے خلاف چلی جائے۔

صرف وہی نہیں جو اسوقت اُس سے متوسل و وابستہ ہیں بلکہ بہت سے لوگ جو اس رئیس سے کوئی توقع رکھتے ہیں یا کسی اندیشۂ فردا کا احساس رکھتے ہیں۔ اگرچہ اسوقت

یہ کہنے کے لئے طیار رہتے ہیں کہ اسلام جمہوریت کا حامی ہے اور اسلام نے جمہوریت کی بنیاد قائم کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت اگر صحیح معنوں میں جمہوریت ہو تو یقیناً بہت سی اُن شکایات کا علاج اُسکے ذریعہ سے ہو سکتا ہے جو ایک شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں لیکن وہ نظام جمہوری جو اسوقت دنیا میں قائم ہے وہ اُن مصالح و اغراض کو پورا نہیں کرتا جو نظام جمہوریت کے لئے عالم خیال میں متعین کر لئے گئے ہیں۔ آپ اُن بڑی بڑی جمہوریتوں کو جانے دیجئے جو سلطنتوں کی شکل میں ہوتی ہیں یہ چھوٹے چھوٹے نظام جمہوری جو ہر محل کے لحاظ سے اور ہر شعبہ کے اعتبار سے آپکے پیش نظر رہتے ہیں ان میں کیا حقیقۃً جو لوگ برسر اقتدار آتے ہیں وہ جمہور کے نمائندے ہوتے ہیں اور کیا واقعی جمہور کے اغراض و مقاصد ان لوگوں سے اُس طرح پورے ہوتے ہیں جس طرح سے ظاہر کئے جاتے ہیں اور ان اشخاص کو افراد جمہور کے تکالیف و ضروریات کا صحیح احساس ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تمام افراد جمہور اہل الرائے ہوتے اور ہر شخص صلاحیت رکھتا ہوتا اس بات کی کہ وہ کسی مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ کون شخص ہمارے مفاد اور اغراض کے لئے مفید ہے اور کون مضر ہے۔ کون شخص ہمارا نمائشی ہمدرد ہے اور کون حقیقی کس کے دعاوی و مواعید دغا سے دوچار ہو سکتے ہیں اور کس کے دعاوی و مواعید دغا سے بالکل بیگانہ۔ اگر ان تمام باتوں کو یہ سب سمجھ سکتے ہوتے اور اسکے ساتھ اپنی قوت ارادی کو صرف کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے یعنی اتنی اخلاقی

حاصل کرلیں حقیقت یہ ہے کہ عالم دین میں مختلف طرح کی حیثیتیں شریک ہیں۔ وہ فرد
بنی آدم ہونے کے لحاظ سے ایک آدمی ہے۔ بحیثیت ساکن شہر ہونے کے ایک شہری
ہے۔ بحیثیت دماغ رکھنے کے ایک عاقل ہے اور پھر بحیثیت علم شریعت رکھنے کے عالم دین
ہے۔ بحیثیت فقہ سے واقف ہونے کے فقیہ اور بحیثیت قوت اجتہادیہ رکھنے کے مجتہد ہے۔
آپ اُنکے پاس گئے۔ میونسپلٹی کا انتخاب درپیش ہے۔ آپنے اپنی کارکردگی بیان کی
دو ایک اصحاب کا حوالہ دیا کہ وہ بھی اس سے خوب واقف ہیں۔ خود اپنے خصوصیات بتلائے
کہ میں کون ہوں۔ وہاں ظنوا بالمؤمنین خیرا کا اصول پہلے سے جاری ہے۔
افعال المسلمین محمولۃ علی الصحۃ بھی موجود ہے۔ اقوال میں فطرت کا تقاضا سچائی
پر محمول ہونا موجود ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عالم دین صاحب نے تحسین وآفرین کہی۔ ارشاد کیا واقعی آپکے
خدمات قابل قدر ہیں۔ بس اب کیا ہے جلدی سے کاغذ پیش کیا کہ حضور اس پر تحریر فرمادیں
وہاں بھی قلم اٹھا یا گیا اور لکھدیا گیا لیکن لکھنے والے نے بحیثیت ایک ذی شعور انسان
ہونے کے لکھا۔ بحیثیت ایک باشندۂ شہر ہونے کے لکھا۔ بحیثیت ایک عاقل ہونیکے
لکھا۔ جو شخص کسی انسان کیسا تھ کچھ تعلقات رکھتا ہو اور اسکی کارکردگی سے کسی حد تک واقف ہو
اُسے حق ہے کہ وہ اظہار رائے کرے اور اگر وہ شہر میں رہتا ہے اور سڑکوں پر سے عبور کرتا
ہے تو اُسے اُن سڑکوں کی حالت خوش انتظامی یا صفائی کے اظہار کا بھی موقع ہے لیکن
یہاں نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اس تحریر سے غلط فائدہ اٹھا یا گیا یعنی اُس تحریر کو

اس کی ذات سے تعلقات نہیں مگر صرف اس امید اور خوف کی وجہ سے کہ آئندہ ہماری ضرورت وابستہ ہو گی یا کہیں اس کے ذریعے سے ہم کو یہ نقصان نہ پہونچ جائے وہ بھی صرف اس رئیس کی موافقت کی بنا پر اُسی کے ساتھ اتفاق کریں گے! اور بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جو نہ کوئی اُمید رکھتے ہیں اور نہ کوئی اندیشہ لیکن صرف اپنے نفس کے چھوٹے پن سے اُسکی دولت و حشمت کو ایک بڑی چیز سمجھ کر اُس کے اشارہ کے سامنے سرنگوں ہو جانا اپنی فطرت کا تقاضا پاتے ہیں۔ یہ لوگ اُس کی بات نہیں مانتے صرف اس لئے کہ وہ ایک بڑا آدمی ہے۔

اب اس رئیس کے موافق کر لینے کے بعد اتنی کثیر التعداد رائیں جو حاصل ہوئیں اور انکے ذریعے سے جس اکثریت کی تشکیل ہوئی وہ حقیقتہ اکثریت ہے یا وہ نام ہے صرف اس ایک رئیس کی رائے کا جس کے زیر اثر یہ سب کچھ ہوا ہے؟

اسی طرح دوسرے ایسے لوگ جن کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ضروریات خلق کا تعلق ہے۔ جیسے وکیل بیرسٹر حکیم۔ ڈاکٹر ان میں سے کسی ایک کو ہموار کر لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جتنے لوگوں کے ضرورتیں یا اُن سے وابستہ ہیں وہ سب متفق ہو جائیں۔

سب سے زیادہ مُوثر۔ سب سے زیادہ لوگوں کو دھوکا دینے والی چیز۔ سب سے زیادہ لوگوں کے دماغوں کے اوپر اثر ڈالنے والی چیز اور سب سے زیادہ گمراہ کن چیز یہ ہے کہ اس طرح کے دنیاوی معاملات میں جیسے میونسپلٹی کا انتخاب۔ کونسل کا مقابلہ کسی خاص جگہ کی امیدواری ان تمام مواقع میں کسی عالم دین کے دستخط لے لیں اور انکی تائید کو

رہنے والے۔ بہت کم ادھر ادھر جانیوالے اور گردش کرنیوالے ہیں سچ کہتا ہوں کہ
بہت ممکن ہے ہم کو اپنے سکونتی حلقوں کے اکثر راستوں اور گلیوں کے کبھی دیکھنے کا
اتفاق بھی نہ ہوا ہو اور صرف محدود ایک راستے ہیں وہ ہوں جن سے ہم عام طور سے گذرا
کرتے ہیں اور پھر ہمیں اتنی توجہ کہاں کہ ہم پورے طور پر راستہ کے تمام خصوصیات کو برابر
دیکھتے رہا کریں۔ اس صورت میں ہماری یہ رائے کہ میونسپلٹی کے انتخاب میں فلاں شخص
کو ووٹ دیا جائے کیا وزن رکھتی ہے۔ اور جہاں گشت، وجہاں پیما اشخاص کو جو ہر راستے
گلی میں برابر گذرتے رہتے ہیں اور ہم سے زیادہ حالات شخصی سے واقف ہیں ہماری
اس رائے سے متاثر ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

یقینی جو شخص علماء کے تحریرات اس غرض سے حاصل کرتا ہے کہ اُن سے عامۂ افراد
کے ذہن کو متاثر کرے وہ ایک انتہائی گمراہ کن فریب کاری کا مجرم ہے۔ اب ان تحریرات
کے اثر سے جو رائیں حاصل ہونگی انھیں حقیقۃً یہ سمجھنا کہ وہ اتنے اشخاص کی رائیں ہیں
بالکل غلط ہے اور ان رایوں کی اکثریت سے جو جمہوری شکل طیار ہو اُسے کبھی جمہوریت
کا صحیح مصداق نہیں سمجھا جا سکتا۔

عوام کی یہ حالت بھی ہوتی ہے کہ جس شخص کے متعلق شہرت دیدی جائے کہ فلاں شخص کو
بہت رائیں ملینگی۔ کامیاب ہی ہوگا بس اب جو ہے اُسے میلان طبع اُس کی طرف ہو جائیگا
جس طرح کسی بڑے مقام پر جیسے آصف الدولہ کا امام باڑہ مجلس کیجیے اور لوگوں کو
یقین دلا دیجیے کہ اس مجلس میں بڑا مجمع ہوگا۔ اب ہر شخص یہی خیال ذہن میں لیکر اس مجلس

بحیثیت ایک عالم دین کے فتوے کے شائع کیا جس سے اُس کے مقلدین اور مخلصین
و معتقدین کی کثیر تعداد پر اثر پڑے۔ اُن میں اگر سمجھنے کی صلاحیت بھی ہو تو وہ
اُس صلاحیت سے فائدہ نہ اُٹھائیں دماغ کی طاقتیں صرف ہونے ہی نہ پائیں حالانکہ
اگر خود مجتہد سے پوچھا جائے کہ کیا اس مسئلہ میں کہ فلاں شخص کو ووٹ دیا جائے تقلید
واجب ہے، تو وہ خود لکھ دیگا کہ نہیں، تقلید کے احکام شرعی کلیات میں جاری
ہوتے ہیں لیکن افراد و جزئیات کے خصوصی حالات وہ عام افراد کے ذاتی عقائد اور آراء سے
تعلق رکھتے ہیں۔

ان میں مجتہد اگر رائے ظاہر بھی کریگا تو وہ بحیثیت مجتہد کے نہیں ہوگی بلکہ
بحیثیت ایک عاقل و صاحب الرائے انسان کے ان باتوں میں بہت ممکن ہے کہ مجتہد
کی رائے صحیح نہو اور آپ کی رائے اسکے مقابلہ میں صحت رکھتی ہو۔

اس لئے یہ ہرگز روا نہیں ہے کہ انتخاب کے معاملہ میں ایک مجتہد کی تائید کو وہ حیثیت
دی جائے جو کسی شرعی مسئلہ میں اُس کے فتوے کی ہوسکتی ہے۔ یہ بات کہ فلاں شخص حقیقۃً
منتخب ہونے کے قابل ہے یا نہیں اس میں آپ خود رائے قائم کیجئے اور اپنے معلومات سے
کام لیجئے۔ بہت ممکن ہے آپ کو اس شخص کے ایسے اوصاف اور حالات معلوم ہوں جو مجتہد
کے علم میں بھی نہیں ہیں۔ کیونکہ علماء کے سامنے تو ہر شخص چھپا بنکر آتا ہے اور اپنے تئیں
اچھا انسان ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اسے پورے طور پر سمجھ نہیں سکتے
کیونکہ اُن کے تعلقات کم اور وہ اپنے گھر میں بیٹھنے والے اور اپنے کاموں میں مصروف

بات یہ ہے کہ ماضی آنکھوں سے اوجھل ہے اس لئے اُس کا اثر قائم نہیں رہتا اور حال کوئی چیز نہیں اور مستقبل بہر حال توقعات سے وابستہ اور توقعات مواعید پہ قائم اور مواعید کا اعتبار الفاظ کی جاذبیت و کشش کیساتھ متعلق۔

پھر دشواری یہ ہے کہ ایک ایسے منصب کے انتخاب میں جو صرف کارگذاری اور عمل سے متعلق ہے لحاظ کیا جاتا ہے خارجی چیزوں کا۔ مثلاً امیدواروں میں ایک سید ہے ایک غیر سید۔ بے شک سید اشرف ہے مگر یہ تو ضروری نہیں کہ وہ اُس کام کو بھی زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دے سکتا ہو۔ اسی طرح یہ کہ فلاں امیدوار اس مذہب کا پیرو ہے اور فلاں امیدوار دوسرے مذہب کا پیرو۔ عوام کو ان باتوں کی طرف توجہ دلانا اور اس کو بڑے مؤثر الفاظ میں پیش کرنا کہ فلاں مسلک عقیدہ جماعت والے کو منتخب نہ کرو کیونکہ اُس کے یہ خیالات ہیں اور یہ خیالات ہیں عوام کے جذبات کیساتھ کھیلنے کا مرادف ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ سوال قابلیت اور عدم قابلیت کا رہا ہی نہیں۔ پھر ان صورتوں سے جو انتخاب ہو وہ کہاں تک مفاد عامہ کو پورا کرنے والا ہو سکتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ جمہوریت درحقیقت ایک جماعتی استبداد ہے جس میں چند لوگ بطور سازش شریک ہوتے ہیں اور تمام افراد جمہور کو مکر و فریب حیلہ و تزویر وغیرہ سے اُسی کا پابند بنا لیتے ہیں۔

اسی وجہ سے وہ امن و امان جو دنیا میں ہونا چاہیئے وہ نہ اُس انتظام میں تھا اور نہ اسوقت کے انتظام میں ہے۔ نہ اُسوقت کمزور لوگ طاقتوروں کے ظلم سے

میں جائیگا کہ بڑی مجلس ہو گی۔ چلنا ضرور چاہیئے۔ حالانکہ اُس کے بڑے ہونے کی تشکیل خود انہی لوگوں کے اجتماع سے ہو گی جو اس خیال کو دلمیں جگہ دئے ہوئے جا رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ عوام کی مثال۔ اکثر و بیشتر اُن تنکوں کی سی ہے جو سیلاب میں بہتے ہوئے ہزاروں کوس چلے جاتے ہیں۔ اُنکے نہ قوت ارادی ہوتی ہے اور نہ کوئی رائے۔ پھر ان افراد کی اکثریت کیا صحت و اصابت کی ذمہ دار ہو سکتی ہے اور اُن کے فیصلہ کو کب جمہوریت کے مفاد کا صحیح پورا کرنے والا سمجھا جا سکتا ہے۔

پھر اس کے ساتھ خواص کی کارستانیاں۔ طرح طرح کے مواعید اور جھوٹی طفل تسلیاں عیوب کی پردہ داری اور محاسن کا اعلان و اظہار۔ حضرت کے سال کوششوں کو منفعت کا لباس پہنانا اور اُن باتوں کو جو مفاد عامہ کے خلاف کی گئی ہوں خدمت خلق کا بھیس بدل کے پیش کرنا۔ اپنی غلطیوں کا انکار اور اُن کی بیجا تاویلیں۔

ایک بات اور ہے کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اگر کسی ممبر سے دوران سال میں شکایات بھی پیدا ہوئیں اور عوام میں اُس کے خلاف ہیجان بھی پیدا ہوا لیکن جب پرانی ہو گئی تو اُس کا کچھ اثر نہیں۔ اب جب انتخاب کا موقع آیا تو وہ آدمی گویا بالکل نیا ہے اس وقت میں اُس سے بڑھکر کوئی ہمدرد نہیں۔ پھر تین سال تک یعنی دوسرے انتخاب کے وقت تک اپنی حالت زار پر گریہ کریں گے افسوس ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ شخص ایسا نکلے گا اور پھر جب موقع آیا تو وہی۔ کہا جا سکتا نہیں اب کی یہ تھپک ہو جائیگا حالانکہ من جرب المجرب حلت بہ الندامۃ "آزمودہ را آزمودن جہل است"

وہ لڑائی تو دو ہوئی اس جنگ کے مقابلہ میں جو دور تہذیب تمدن میں برپا ہوئی۔ اتنی بڑی دنیا کے امن و امان کو صدمہ پہنچانے والی کارزار ہماری آنکھوں کے سامنے آ چکی اس کے بعد ہم کیسے سمجھیں کہ دنیا جس تہذیب و تمدن کی علمبردار ہے وہ حقیقتہً اصلاح عالم کا ذمہ دار ہے۔

آپ اصلاح عالم کی علمبردار طاقتوں کو دیکھئے وہ کتنے تدابیر کر رہے ہیں کہ دنیا کا نظام درست ہو اور تصادم کی صورتیں مفقود ہوں مجلس اقوام قائم کی گئی تمام ممالک کے ذمہ دار نمایندے جمع ہوں تمام معاملات کو یکجہتی و ہم آہنگی، تعاون باہمی کے ساتھ طے کریں لیکن اگر اس مجلس اقوام کے اراکین خود غرضی کے جذبات سے علیحدہ ہوتے یعنی اپنی شخصیت اور جماعتی و ملکی انفرادیت کو فنا کر کے وہ صرف عامہ خلق کے مفاد کو پیش نظر رکھتے تو ان کے ذریعے سے امن و امان عالم ضرور درست ہو جاتا مگر جب صورت یہ ہے کہ زبان پر "عالم" اور دل میں "ہم"، زبان پر یہ کہ دنیا کی تعمیر مقصود اور دل میں یہ کہ اپنی طاقت میں اضافہ اور اپنا زیادہ سے زیادہ فائدہ۔ تو اب سوائے اس کے کہ کاغذ کے صفحات پر انسداد جنگ، تخفیف اسلحہ، صلح عمومی وغیرہ کے کی تجاویز ثبت ہو جائیں۔ مقام عمل میں اس کے خلاف طرز عمل قائم رہے زبان پر یہ کہ لڑائی نہ ہونا چاہیئے اور عمل یہ کہ ہر ملک زیادہ سے زیادہ سامان جنگ کی طیاری میں مصروف اور اس مقصد کے لئے زیادہ سے زیادہ روپیہ صرف کرنے کے لئے موجود۔ بڑے بڑے کارخانے۔ نئے نئے ہولناک حرب کے طریقے۔ اور دنیا کو

محفوظ تھے اور نہ اسوقت محفوظ ہیں۔ عدالتیں ضرور قائم کیجاتی ہیں۔ مگر کسی کو کیا معلوم کہ کتنے غلط مفادات حق بنا دئے جاتے ہیں اور کتنے سچے استغاثے مسترد ہو جاتے ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ درحقیقت دنیا جس اصلاح کی طالب ہے وہ اصلاح کسی طرح اس جمہوریت کے نظام میں نہیں ہوتی جسے دنیا نے خوش آیند سمجھ لیا ہے۔

تہذیب و تمدن کے نام پر فساد کی کارفرمائی

دنیا کی ترقی یا تنزل کی رفتار

اُن چیزوں میں سے جو اصلاح کی ذمہ دار ہیں لیکن عملی طور پر فساد میں صرف کیجاتی ہیں ایک "تہذیب و تمدن" کا آئین ہے اور اس زمانہ میں جبکہ مذہب کی طاقت کمزور بنا دی گئی ہے۔ دنیا کے تمام سلاطین اور ترقی یافتہ اقوام اپنے تئیں اسی چیز کا علمبردار بتلاتے ہیں یعنی تمدن و تہذیب کا لیکن اس تمدن و تہذیب کے پردہ میں عالم میں کیسے فسادات برپا ہوئے اس کو جنگ عظیم سے پوچھئے۔ وہ مہا بھارت کی لڑائی جس کے متعلق اب لوگوں کو شبہہ ہے کہ وہ اصلیت رکھتی بھی ہے یا صرف حق و باطل کی طاقتوں کے تصادم کی ایک تمثیلی صورت ہے۔

ثابت ہوئی ترقی کس طرح نمایاں ہوئی کہ ہری جان لینے کا امکان بڑھا۔ اس کے بعد مختلف
طرح کی چیزوں کی ایجاد ہوئیں۔ توپیں ایجاد ہوئیں، گولے بنے۔ ایسے گولے جو پھٹنے
کے بعد متعدد اشخاص کو ایک ساتھ زخمی کر سکیں یا فنا کریں۔ توپیں ایسی جن کے گولے
بڑی بڑی عمارتوں کو مسمار کر دیں۔ دیکھئے تمدن ترقی کر رہا ہے۔ تہذیب آگے بڑھ
رہی ہے۔ اصلاح عالم کی کوشش بروئے کار ہو رہی ہے یعنی جان لینے کے ذرائع بڑھ
رہے ہیں۔ اچھا اب یہ چیزیں ناکافی ثابت ہوئیں۔ ناکافی کیوں ثابت ہوئیں؟
اگر مقصد جان کا لینا نہ تھا تو کافی اور ناکافی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ معلوم ہوتا
ہے زبان سے دعوی اصلاح عالم کا لیکن دل میں نصب العین فنا کرنے کا۔ نتیجہ کیا
ہوا کہ اب زہریلی گیس ایجاد ہوئے جن میں نہ دشمن کو آنکھ سے دیکھنے کی ضرورت
نہ نشانہ کو تاکنے کی حاجت۔ دور ہی دور سے اس گیس کو مقصودہ فضا میں پھیلا کر
ہر ذی روح کو اس فضا کی ہلاک کر دیا۔ جس میں کتنے ہی بے جرم تھے اور کتنے
غیر ذی شعور۔

ترقی اب تک اس نقطہ پہ پہونچی۔ ابھی ختم تھوڑی ہو گئی ہے۔ آگے آگے
دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

یہ انسان کی ترقی اور تہذیب ہے جس پہ ناز اور فخر کیا جاتا ہے جس کی بنا پر
اصلاح عالم کا دعوی کیا جاتا ہے۔

اب یوں تک یوروپیہ سلطنتوں کی جانب سے نظام حربی میں ہر سال منظوم ترمیم

فنا کرنے کے تدابیر۔ پہلے زمانہ کے سلاطین کار نمایاں سمجھتے تھے عالم کی تعمیر کرنا اور آجکل سرمایۂ ناز سمجھا جا رہا ہے عالم کو فنا کرنے کے زیادہ سے زیادہ سامان کرنا۔
اب بتلائیے کہ اگر یہ چیزیں صرف ہونیوالی نہیں ہیں تو بن کیوں رہی ہیں۔
ہر چیز کا بننا خود اس کے موقع استعمال کا پتہ دیتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔
پھر اگر دنیا امن و امان کے راستے پر جا رہی ہے اور اصلاح کے جادہ پر گامزن ہے تو ضرورت کب ہے ان آلات کے ایجاد کی اور جب ضرورت نہیں تو ایجاد کا محرک کیا ہے؟
اب ملاحظہ کیجئے۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب مواقع جان لینے کے کم تھے ہتھیار تھے خنجر، تلوار۔ دھاردار آلات اسکے لئے ضرورت تھی کہ دشمن سے اتصال ہو۔ اُسوقت اسکی زندگی کے فنا کرنے کا سرانجام ہو۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ امکانات جان لینے کے کم تھے۔ دنیا نے جب ترقی کی اور تمدن زیادہ ہوا تو تیر۔ فلاخن وغیرہ ایسی چیزوں کی ایجاد ہوئی جن سے حربہ دور تک جاتا ہے۔ امکان جان لینے کے بڑھے مگر تیر ایک محدود مسافت تک جانے والا اور ایک محدود دائرہ رکھنے والا۔ اگر کسی خاص محل مثلاً سینہ وغیرہ پر پڑ گیا ہے اس طرح کہ توڑ کر نکل گیا تب تو زندگی کو ختم کر دیتا مگر یوں کثیر التعداد تیر ایک انسان کے جسم پر پڑتے اور پھر بھی اسکی زندگی ختم نہ ہوتی بلکہ تیر کو کھینچ کر پھینک دینے پر صرف ایک زخم ہوتا جو نمایاں ہو جاتا۔ پھر زمانہ نے ترقی کی۔ بندوق کی ایجاد ہوئی۔ اسکی گولی تیر سے بھی زیادہ خطرناک

نظام ہی ترقی پسند ہے تو پھر اب یہ متضاد قدم جو اُٹھنے لگے جو رفتہ رفتہ قریب لارہے ہیں اسی ابتدائی منزل کی طرف بلکہ جماعت انسانی کے ایک طبقہ میں وہ منزل بالکل آ ہی گئی ہے ان قدموں کو میں کیا سمجھوں۔ ترقی کے قدم یا تنزل کے؟

نظام اجتماعی اور نظام معاشرتی میں ایک دوری حرکت نظر آ رہی ہے۔ مادی تاریخ کے رو سے ایک وقت میں انسان جانوروں کی طرح "فطرت" کی سادی زندگی گزارتا تھا۔ لباس نہیں۔ مکان نہیں۔ رفتہ رفتہ خیال پیدا ہوا کہ ہم کو لباس کی بھی ضرورت ہے۔ مجموعۂ عالم انسانی کو ایک متوازی حیثیت سے یہ احساس پیدا ہو رہا ہے۔ اسے میں نتیجۂ ترقی سمجھوں یا صورت تنزل۔ اگر نتیجۂ تنزل تو وہ آپ کا نظریہ کہ دنیا بالطبع ترقی کی طرف مائل ہے اور ہر نوع اپنے حدود میں آگے بڑھتی رہتی ہے یہاں تک کہ جب اس نوع کے حدود میں ترقی کی منزلیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ دوسری بالاتر نوع کی طرف منتقل ہو جاتی ہے لیکن ترقی سے باز نہیں رہتی اگر شروع کے پیدا شدہ احساسات معاشرتی و تمدنی کو میں نوع انسان کا تنزل سمجھوں تو یہ ماننا پڑیگا کہ طویل زمانہ تک عالم انسانی مائل بہ تنزل رہا ہے۔ وہ سب سے پہلا نقطہ جو تھا یعنی فطرت سادہ کا وہ نقطۂ ترقی تھا اور اسکے بعد جب اسکو تکلفات و تصنعات کی طرف توجہ پیدا ہوئی تو یہ سب قدم پستی کی طرف جانیوالے تھے لیکن یہ آپ کے اصول کے خلاف ہے۔ آپ کی بنا پر جو قدم انسانیت نے اٹھایا وہ ترقی ہی کی طرف تھا۔ ان قدموں کے منازل تدریجی آگے بڑھتے رہے پہلے یہ احساس

اور ہر حکومت اس کا خمیر میں اپنی قدرت و طاقت بھر حصہ لیتی ہے۔ اس کا نام ہے تہذیب
اور یہ ہے تمدن جو اپنی ترقی کے ساتھ دنیا کی بربادی کا سامان مہیا کر رہا ہے۔ اس کے بعد
کہا جاتا ہے کہ عالم ترقی کر رہا ہے مگر ترقی کر کے ہر شے اپنی ابتدائی منزل سے دور ہوتی ہے۔
یہ نہیں ہوتا کہ وہ ہر پھر کر ابتدائی نقطہ پر آجائے۔ آپ پنے مکان سے روانہ ہوے
مدرستہ الواعظین کے زیادہ سے تھوڑی دیر میں دیکھا تو پھر اپنے مکان کے دروازہ پر
تھے۔ اسکے معنی یہ ہونگے کہ جو قدم آپ منزل مقصد تک پہونچنے کے خیال سے اٹھا رہے
تھے وہ معکوسی حیثیت رکھتے تھے اور جہاں سے چلے تھے وہیں سے قریب لا رہے تھے
دنیا برابر چلتی رہی اگر یہ ترقی ہی کرتی رہتی تو اب سکے دور وحشت کو پھر واپس آنا
چاہیے تھا۔ وہ ابتدائی بہیمت کا زمانہ جبکہ انسان برہنہ رہتا تھا اور اُسے لباس
کی ضرورت نہ تھی جبکہ آفتاب کی شعاعیں پوری طاقت سے اُس پر پڑتی تھیں اور
اُس میں غیر ارادی طور پر بھی وہ روزانہ نہایا کرتا تھا۔ یہ دور تھا جس سے بقول
ارباب ارتقا انسان کی ابتدا ہوئی تو اب اگر حقیقتہً دنیا نے ترقی کی ہے اور یہ نظام
ہی ترقی پر مبنی ہے تو ماننا پڑیگا کہ وہ ابتدائی نقطہ پستی کا نقطہ تھا جس کے بعد انسانیت
رفتہ رفتہ آگے بڑھی ضرورت محسوس ہوئی لباس کی اور لباس میں تنوع پیدا ہوا
اور تدریجی زیادتی ہوئی یہانتک کہ مختلف ممالک میں مختلف طرح کے لباسوں
کی ایجاد ہوگئی۔

اگر یہ تمام قدم جو اٹھ رہے تھے ترقی کے تھے اور ہونا یونہی چاہیے جبکہ عالم کا

تنزل کے قدم ہیں جن کا نتیجہ ہر وہی پستی جو دور اول میں انسان کے لئے حاصل تھی۔

بات یہ ہے کہ انسان جب تک راستے میں ہے وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ راستہ منزل سے قریب کر رہا ہے یا دور لیکن جب نتیجہ سامنے آجائے اور آخر میں دیکھے کہ جہاں سے چلا تھا وہیں پہونچ گیا تو معلوم ہوگا کہ یہ سب گام الٹے تھے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ایک ہی دفعہ صورت نہیں پیش آسکتی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ بہت پہلے سے راستہ غلط ہوگیا تھا اور رخ بدل چکا تھا۔ آپ کے خطوط سیر کے وسطی حدود میں کوئی نقطہ ایسا تھا کہ اس نقطہ کے بعد اگر آپ کسی خاص طرف آگے بڑھتے تو جادہ پیمائی ٹھیک ہوتی لیکن اس نقطہ کے بعد آپنے کوئی ایسا پھیر کھالیا جس کے بعد اب جو قدم بھی آپنے اٹھایا وہ پیچھے لانیوالا تھا آگے بڑھانے والا نہیں لیکن اس کا پتہ آپ کو اسوقت چلیگا جب ایک مرتبہ آپکے سامنے آپ کا وہی مکان آجائیگا جہاں سے کہ آپ روانہ ہوئے تھے اسی صورت سے نوع انسانی کی رفتار کو دیکھئے۔ ہم چلے تھے کہاں سے برہنگی کی منزل سے بڑھے اور بڑھتے چلے گئے اور نہ معلوم کبتک حقیقتہً بڑھتے رہے اسکے بعد ہم نے قدم روکے نہیں چلنا جاری رکھا اور سمجھتے بھی رہے کہ بڑھ رہے ہیں لیکن واقعاً اب قدم پیچھے ہٹ رہے تھے اور رجعت کی طرف میلان تھا یہاں تک کہ ہم نے آنکھیں کھولیں تو نوع انسانی اسی دروازہ کے سامنے نظر آئی جہاں سے چلی تھی یعنی برہنگی کا دروازہ کیا اب بھی ہماری سمجھ میں نہیں آئیگا کہ ہمارا راستہ مدتوں سے غلط ہوگیا تھا اور جسے ہم ترقی سمجھ رہے تھے وہ حقیقتہً تنزل تھا۔ اور کچھ نہیں۔ وہ فساد تھا جسے ہم صلاح

پیدا ہوا کہ بالکل برہنگی اچھی نہیں شرم وحیا کا جذبہ پیدا ہوا اور ضروری مخصوص اجزائے
جسم کے ستر کا احساس پیدا ہوا۔ پھر اُس پر اضافہ ہوتا رہا۔ آخر میں تمام جسم پر لباس
آیا۔ اب یہ درجہ انتہائی حد کو پہونچ گیا یعنی پورا جسم انسانی ڈھک گیا۔ لیکن اس کے
بعد ہم دیکھ رہے ہیں کہ جیسے ہلال کے بدر بننے کے بعد پھر محاقی رفتار شروع ہوتی ہے اسی طرح
یہ معاشرت انسانی اس منزل پر پہونچنے کے بعد پچھلے پاؤں پلٹی یعنی جس طرح تدریجی
حیثیت سے اضافہ ہوا تھا اُسی طرح تدریجی حیثیت سے تخفیف شروع ہوئی۔ لباس
کے طویل و عریض ہونے کے بجائے اختصار کی طرف خیال گیا۔ پاؤں گٹے کھلے کلائیاں
کھلیں، کہنیاں کھلیں، بازو کھلے سینہ پر گلا کھلا، حلق کھلا و گدی کا حصہ کھلا
گریبان کے حصہ کا سینہ کھلا۔ پیروں میں گٹے کھلے، پنڈلیاں کھلیں، گھٹنے کھلے اور
رانوں تک نوبت پہونچی اب یہ رفتار اپنی انتہا تک یعنی نقطۂ ابتدائی تک پہونچ گئی
تحریک برہنگی کے ذریعہ سے جو اس وقت ممالک متمدنہ میں برابر بڑھ رہی ہے اور خود
آپ کے ہندوستان میں ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے جس کا خیال یہ ہے کہ برہنگی انسانوں
کے لئے مفید ہے۔

یہ معکوس قدم اٹھے اور پہلی منزل تک پہونچ گئے جہاں سے کہ چلے تھے تو اگر
ابتدائی قدم جو عالم انسانی نے اُٹھائے تھے وہ ترقی کے قدم تھے اور ضرور تھے کیونکہ
ابتدا انسانیت کی یقیناً پستی سے تھی اور پھر بلندی حاصل ہوئی تو ماننا پڑیگا کہ یہ
قدم جو اب اٹھ رہے ہیں اور پہلی منزل کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہے ہیں یہ سب

خیر باد کہا۔ ان سب باتوں کے بجائے تصنع آ گیا۔ فریب کاری آ گئی۔ ملمع سازی آ گئی۔ اگر اس کا نام ہے ترقی تو بے شک عالم انسانیت ترقی کر رہا ہے۔ تو بیشک تمدن اور تہذیب اپنے انتہائی نقطۂ کمال تک پہونچ گیا ہے لیکن حقیقتہ یہ تمام صورتیں فساد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور وہ تمدن و تہذیب جو صلاح عالم کے نام سے دنیا میں برسرِ کار ہے وہ ایک بڑا ذریعہ ہے دنیا کو فساد کے راستے پر پہنچانے کا مگر تفرقہ کیونکر ہو اس لئے کہ دنیا ظاہر پرست ہے اور ظاہری حدود میں بلندی ہی بلندی ہے پستی کا نام نہیں پھر کیونکر یقین کیا جائے کہ یہ بلندی اصلا پستی ہے اور یہ ترقی حقیقتہ تنزل ہے۔

طبائع انسانی میں فساد کے تقاضے

فساد کا تقاضا انسان کی طبع میں اُن مادی خصوصیات کی بنا پر پایا جاتا ہے جو انسان میں اس کی جسمانی حیثیت سے ودیعت ہیں کیونکہ انسان بحیثیت جسمانی تمام کائنات کا لب لباب ہے یعنی اس میں جمادیت کے آثار بھی ہیں نباتیت کے آثار بھی ہیں اور اسی طرح حیوانیت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں اور ان آثار کے لازمہ میں نقائص اس میں پیدا ہوتے ہیں جنکا دفعیہ اور ردِ عمل اُن خصوصیات سے ہوتا ہے جو اس میں بحیثیت انسانی ودیعت ہیں۔

اس مادیت اور روحانیت کی سموئی ہوئی کیفیت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس میں

سمجھ رہے تھے وہ تخریب تھی جسے تعمیر کے نام پہ کیا جا رہا تھا۔

معلوم ہوا کہ یہ تمدن اور تہذیب جو اصلاح عالم کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے یہی ہمیں فساد کی طرف لئے جا رہا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اسوقت دنیا میں ہی وحشت وہی ہیمیت وہی درندگی موجود ہے جو اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ کتوں کا ہڈیوں پر لڑنا۔ بلیوں کا ایک دوسرے کو دیکھکر غرانا۔ مینڈھوں کا آپس میں سر ٹکرانا۔ بھیڑیوں کا بھیڑوں کو شکار کر لینا اور چیر پھاڑ کر کھا جانا سب اس "ترقی یافتہ" "مہذب" "متمدن" انسان میں پایا جا رہا ہے بلکہ اسکی ضرر رسانی اور خطرناکی میں اضافہ ہو گیا ہے اسلئے کہ ان تمام باتوں میں فطرت والی سادگی یا سچائی باقی نہیں رہی ہے بلکہ مکارانہ تصنع اور جعلسازانہ نبوٹ کا غلاف چڑھ گیا ہے یعنی سابقہ زمانہ کا انسان اگر جانور تھا تو سچا بے لوث جانور اور اب انسان جانور بھی ہے اور جھوٹا مکار دغاباز جعلساز بھی ہے۔

وہ طاقت اور اقتدار کا مظاہرہ صرف اپنی درندگی کی بنا پر کرتا تھا اور عملاً ظاہر کرتا تھا کہ وہ درندہ ہے لیکن آج کا انسان اپنا اور اپنی زندگی کو "تنازع للبقا" کے نظریہ کا لباس پہنا دیتا ہے۔

آفتاب کی شعاعوں سے دور رہنگی میں انسان ہمیشہ متمتع ہوتا تھا لیکن وہ "آفتابی غسل" کا فریب آور نام نہیں جانتا تھا۔ اب یہ نام ایجاد ہو گیا اس لئے بھولے بھالے لوگوں کو اس کی افادی حیثیت کا یقین بھی دلایا جاتا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ افتاد طبع میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ برے اوصاف جتنے تھے اسی طرح قائم ہیں لیکن فطرت کی سچائی رخصت ہو گئی اور سادگی چلی گئی خلوص کے

اسی لئے انسانوں میں مفسد اور مصلح دونوں طرح کے نمونے پائے جاتے ہیں اور چونکہ اصلاح اور افساد دونوں ذرایع کے محتاج ہیں اس لئے بہت سے اُن انسانوں میں جو ظاہر میں کچھ بھی نہیں نہ مصلح ہیں نہ مفسد صلاحیتیں ایسی موجود ہیں کہ اگر ان کے ساتھ اسباب شریک حال ہو جائیں تو اُن سے بڑھ کر مصلح یا مفسد کوئی نہو۔

یہ ظاہر ہے کہ جبتک کسی طرح کا اقتدار نہ حاصل ہو اور کسی قوت کا سہارا نہ ملے اُس وقت تک کسی طرح کی کوشش بار آور نہیں ہوسکتی نہ کوشش اصلاح اور نہ کوشش افساد ممکن ہے کچھ لوگ ایسے نیک دل ہوں کہ اُن کے دل میں بہت سے ارادے ہوں اصلاح عالم کے مگر وہ بے دست و پا ہونے کی وجہ سے اپنے اُن ارادوں کو مقام عمل میں لا سکتے ہوں یہ لوگ اپنے ضمیر اور اپنی نیت کے لحاظ سے صالح و مصلح ہیں مگر دنیا میں مصلح ہونے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ اسباب اُنکے پاس مفقود ہیں۔ اسکے برخلاف بہت سے لوگ دنیا میں ایسے ہیں کہ جو فساد کا زہر رکھتے ہیں اور مفسدہ پرور ہیں۔ اگر اُن کو موقع ملے تو فساد برپا کریں اور عالم کو خرابی کے اس نقطہ تک پہونچا دیں جس کے بعد اصلاح غیر ممکن ہو مگر اُن کو ایسے مواقع حاصل نہیں ہیں۔

وہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کا سامان نہیں پاتے اور نہ اتنا اقتدار رکھتے ہیں کہ جو بات کہیں اُسے لوگ مان لیں اور تسلیم کر لیں۔

بلندی اور پستی دونوں کی انتہائی صلاحیتیں پیدا ہوگئی ہیں یعنی وہ بڑھے تو فرشتہ سے بالاتر ہو جائے اور گھٹے تو حیوانات سے بدتر ہو جائے۔ فساد انسان کی مادی حیثیت کے تاریک پہلو کا نام ہے اور اسی لئے جب اس نوع کے مخلوق پیدا ہونے کا سوال آیا تھا تو جبھی اس کے اس تاریک پہلو پر نگاہ انتقاد پہونچ گئی تھی اور اُسے فساد کا مرکز سمجھ لیا تھا۔ واذ قال ربك للملٰئكة انی جاعل فی الارض خليفة قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء۔

"جب کہا گیا قدرت کی طرف سے کہ میں زمین میں ایک مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو میری خلافت کے فرض کو انجام دے تو ملائکہ نے کہا کہ کیا ایسا مخلوق مقرر کیا جائیگا جو اُس زمین میں فساد پیدا کرے اور خوں ریزیاں کرے"۔

بے شک یہ فطرت انسانی کا تاریک پہلو ہے اور اُسی کا روشن پہلو وہ ہے جو ان فسادات کو روکنے کا باعث ہوتا ہے جسے خدا نے انی اعلم ما لا تعلمون کے مبہم الفاظ میں مضمر رکھا۔

ان دونوں متضاد پہلوؤں کا نتیجہ ہے کہ کبھی انسان اُس پہلو کی طرف جھک جاتا ہے اور مفسد بن جاتا ہے اور کبھی اس پہلو کی طرف تو مصلح بن جاتا ہے اسلئے یہ انسان دنیا میں شیطان کا مجسمہ بھی ثابت ہوتا ہے اور رحمٰن کا نمائندہ بھی قرار پاتا ہے یہ انسان عالم میں گمراہ کن ہوتا ہے اور یہی انسان دنیا میں مجسمۂ ہدایت بھی۔

طاقت ہو یہ علمائے مذہب کا طبقہ ہے اور دوسرے گروہ جس کے پاس سلطنت کی طاقت ہو یہ سلاطین و ملوک ہیں ۔

یقیناً اصلاح عالم کی یہ سب سے بڑی دو طاقتیں ہیں۔ اسکے بعد دوسرے جزوی اسباب ہیں جو ایک انسان کی بات کو قابل پذیرائی بناتے ہیں جیسے خوش بیان مقررین۔ خوش تحریر انشا پرداز۔ خوش فکر شعرا وغیرہ لیکن یہ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے اکثر پہلی دو قسم کی طاقتوں کے زیر اثر کام کرتے ہیں اور اُن کا اثر بھی جزئی حیثیت رکھتا ہے کلی و نوعی نہیں ہوتا اور نہ زیادہ دیر پا۔

علمائے مذہب کی مصلحانہ حیثیت

پہلا طبقہ علمائے مذہب کا، اگر حقیقت میں دنیا کو مذہب کی ضرورت ہے تو علمائے مذہب کی بھی ضرورت ہے کیونکہ یہ عالم کے نظام کے خلاف ہے کہ دنیا میں ہر شخص ہر چیز کا ماہر ہو سکے جس طرح ہر چیز کے لئے ایک مخصوص طبقہ ہوتا ہے اور ایک مخصوص جماعت، تقسیم عمل کے اصول کے مطابق کوئی ایک طبقہ وکلا کا ہوگا۔ ایک طبقہ اطبا کا۔ اور اسی طرح تمام ضروریات انسانی کے لحاظ سے تجار اور معمار وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ایک طبقہ علمائے مذہب کا بھی ہوگا اور یہ بھی دنیا کے اصول پر مبنی ہے کوئی نئی چیز نہیں کہ ہر شعبہ میں رجوع ہونا چاہیئے اُسی طبقہ کی طرف جو اُس شعبہ کا ماہر ہو یعنی ہمیں کوئی صندوقچہ بنوانا ہو تو ہم جاتے ہیں نجار کے پاس۔ ہم کو کسی مقدمہ کی پیروی کرانا ہو تو

صلاح اور فساد کی ذمہ دار طاقتوں کی تشریح

میں نے اقسام فساد کے ذیل میں اجمالاً اُن اشخاص اور جماعتوں کا ذکر کیا ہے جو صلاح و فساد کی ذمہ دار قرار پا سکتی ہیں۔

بات یہ ہو کہ صلاح اور فساد انسان کا جب تک متعدی شکل اختیار نہ کرے مصلح یا مفسد ہونیکا امکان پیدا نہیں ہوتا۔ اور اس اثر کے متعدی ہونے کے لئے یعنی دوسرے اشخاص کو اس شخص کی تعلیم پر عمل پیرا ہونے یا اُس کے افعال کی پیروی کرنے کا کوئی خاص سبب ہونا چاہیئے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ہر انسان بجائے خود دوسرے انسانوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتا اور یہ سبب صرف یہی ہے کہ اس انسان کو کوئی ایسا تفوق ہو دوسرے افراد پر جو اُن کو اس کی بات ماننے پر آمادہ کرے یا اس میں کسی طرح کی جاذبیت پائی جائے کہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا سکے۔

جب یہ ہوگا تب ہی یہ انسان دوسرے اشخاص پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اب اگر وہ نیک نیت ہو اور بجائے خود صالح ہے تو وہ مصلح بنے گا اور اگر بدنیت ہو تو مفسد اس کا لازمہ یہ ہے کہ جو طبقہ دنیا میں بہترین اصلاح کر سکتا ہے وہ ہی بدترین افساد بھی کر سکتا ہو اور جو عالم کی تعمیر کر سکتا ہے وہ ہی انتہا درجہ تخریب بھی کر سکتا ہے۔

اب وہ طبقے جو دنیا میں اصلاح کے ذمہ دار ہیں اور حقیقتاً اُن کے ذریعہ سے دنیا میں اصلاح ہوتی ہے اور ہو سکتی ہو وہ دو طبقے ہیں۔ ایک وہ طبقہ جس کے پاس مذہب کی

تو ان کو رجوع کرنا بھی علمائے مذہب کی طرف ضروری ہوگا۔

اب اگر فرض کیا جائے کہ کوئی خاص شخص مدعی ہے کہ میں خود احکام شرع کو سمجھ سکتا ہوں اور رائے قائم کر سکتا ہوں تو وہ اپنے اس دعوے کے لحاظ سے میرے موضوع بحث ہی سے خارج ہوگا کیونکہ میں تو اُن لوگوں کو کہہ رہا ہوں جو ناواقف ہیں اور خود رائے قائم نہیں کر سکتے انھیں بہرحال ضروری ہے کہ دریافت کریں اُن لوگوں سے جو خود سمجھ سکتے ہیں اور رائے قائم کر سکتے ہیں اُس پہلی قسم کے لوگوں کا نام ہے مقلدین اور دوسری جماعت کا نام ہے مجتہدین۔

تقلید ہرگز پیری مریدی نہیں ہے۔ نہ وہ حلقۂ بیعت ہے۔ نہ وہ خط غلامی ہے بلکہ وہ وہی ہے جو دنیا کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے اور جس سے نظام زندگی میں گریز و گزیر نہیں یہی جماعت اصلاح خلق کی ذمہ دار ہے۔ اور غیر ممکن ہے کہ علمائے مذہب اپنے حقیقی علوم کے اعتبار سے کبھی فساد پیدا کریں۔ مگر جس طرح مذہب کے بارے میں میں نے کہا تھا کہ ایک ہوتا ہے حقیقی مذہب وہ ہمیشہ اصلاح خلق کا سبب ہوتا ہے اور دوسری نمائشی اور ملمع کار مذہب کی صورت ہوتی ہے۔ یہ فساد کا ذریعہ ہوتی ہے۔

اسی طرح علمائے مذہب میں جو ہوتے ہیں حامل حقیقت مذہب کے وہ اصلاح ہی کرتے ہیں۔ فساد کبھی نہیں پیدا کرتے ہیں اور جو اس نمائشی شکل اور ملمع کار صورت کے حامل ہوتے ہیں وہ بے پناہ فساد کا ذریعہ قرار پاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جو سب سے زیادہ قوی ترین ذریعہ اصلاح کا ہے جب فساد کی طاقت

ہم جاتے ہیں وکیل کے پاس کسی مریض کا علاج کرانا ہو تو جاتے ہیں حکیم۔ ڈاکٹر کے پاس یونہی زندگی کے ہر شعبہ میں جو اُس شعبہ سے ناواقف ہوگا وہ رجوع کریگا اُس کے واقفکار کی طرف۔ ایک طبیب نے نسخہ لکھا تو آپ یہ نہ پوچھیے گا کہ یہ دوا کیوں دی اور وہ دوا کیوں۔ ایک انجینیر نے نقشہ مرتب کیا تو یہ شوریافت کیجیے گا کہ یہ چیز اس طرح کیوں اور وہ اُس طرح کیوں۔ اس لئے کہ یہ تو ایک چیز ہے نظام کے مطابق کہ جب ایک انسان ناواقف ہو اور اپنی ناواقفیت کا احساس بھی رکھتا ہو اور دوسرا واقف ہو تو وہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے یہ ناواقف اور واقفکار کی تفریق دنیا کے ہر شعبہ میں کارفرما ہو۔

یہ اور بات ہو کہ جو شعبہ بحیثیت اہمیت اور بحیثیت ضرورت بلند ہو اُس کے جاننے والوں کو عزت زیادہ حاصل ہو اور جو شعبہ بلحاظ اہمیت و ضرورت آپ کی نظر میں کم ہے اُس کے جاننے والوں کے لئے خصوصیت کم حاصل ہے لیکن بحیثیت واقف و ناواقف ہر شعبہ میں دو طبقے قائم رہتے ہیں۔

اگر مذہب کی ضرورت ہے تو ضرور ایک طبقہ ایسا ہوگا جو مذہب کے احکام سے واقف ہو۔ اور باقی لوگ اس سے ناواقف ہوں گے اور اس صورت میں اُن ناواقف افراد کو اس واقفکار جماعت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہوگی۔

بیشک اگر ہر شخص اتنی قابلیت حاصل کر لے کہ وہ مذہب کے احکام کو خود سمجھ سکے تو ہر شخص کو حق ہوگا کہ وہ رائے قائم کرے لیکن جبکہ دنیا کا نظام اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہو اور ضرور کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ جو احکام کے سمجھنے سے قاصر ہیں

نہ صرف اعضاء جوارح میں تبدیلی ہوتی۔ نہ صرف لباس وضع قطع میں تغیر ہوگا بلکہ اسکی اصلی روح تبدیل ہو جائے گی اور پھر تمام کالبد بشری اپنی اس صورت پر قائم نہیں رہیگا۔

بادشاہ کے احکام چونکہ مادی طاقت پر مبنی ہیں اسلئے اُن کا اثر اُسی وقت تک رہتا ہے جبتک وہ سلطنت قائم ہے لیکن جب وہ بادشاہ تخت سلطنت سے اترا یا مر گیا بس اب دنیا بدل گئی۔ اب جو نیا بادشاہ ہوگا اُسکے احکام پر دنیا عمل پیرا ہوگی لیکن روحانی تاثرات اور مذہبی خیالات جو غلط رہنمائی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اُن سے دماغ و عقل میں تبدیلی ہو جاتی ہے اسلئے وہ اتنے دیر پا ہوتے ہیں کہ چاہے وہ رہنما دنیا سے چلا جائے لیکن دنیا اُس کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہتی ہے۔ اس لئے یہ چیز سب سے زیادہ خطرناک اور سب سے زیادہ موجب گمراہی خلق ہے۔

وہ یہود کے عالم ہی تھے جنھوں نے فتویٰ دیا کہ مسیح کو سولی پر چڑھا دیا جائے اور اسی طرح ہر زمانہ میں جو فسادات برپا ہوئے اُن میں ۔ ملع کار علماء فسادات کے ذمہ دار قرار پاتے رہے۔

اسی لئے وہ افراد جو حقیقی مذہب کے علمبردار تھے اُنھوں نے ہمیشہ دنیا کو "گندم نما جو فروش" اشخاص کے فریب سے خبردار کیا۔ اور بتلایا کہ تم اُن سے دھوکا نہ کھانا اور سمجھنے کی کوشش کرتے رہنا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ کون کھرا ہے اور کون کھوٹا۔ کون حقیقت کا سالک ہے اور کون مجاز کو حقیقت کے لباس میں پیش کرنیوالا ہے

اس ذریعہ کا عکس بن گئی یعنی اس پردہ کو اپنے اوپر ڈال لے گی تو وہ قوی ترین ذریعہ فساد کا قرار پا جائے گی۔

مثلاً چاندی اور سونا چاندی کم قیمت کی چیز اور سونا زیادہ قیمت کی چیز ہے تو اب چاندی کا ملمع ہو تو وہ زیادہ فریب دہ ہوگا یا سونے کا ملمع اگر چڑھا دیا جائے تو وہ زیادہ فریب دہ ہوگا۔

جس چیز کی واقعیت زیادہ پر اہمیت اور بیش قیمت ہوگی اسی کی نقلی صورت زیادہ گمراہ کن اور مضرت رساں ہوگی اور جس چیز کی اصل کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اس کی جھوٹی شکل کوئی خاص ضرر رساں نہ ہوگی۔

یہ درحقیقت مذہب کی انتہائی مصلحانہ طاقت ہے کہ اس کا نام انتہائی ذریعہ فساد کا بن سکتا ہے اور یہ علمائے مذہب کی انتہائی مصلحانہ عظمت ہے کہ ان کی نقل اختیار کرنے والے صاحب زیادہ ذریعہ فساد بن سکتے ہیں۔

اسی بنا پر یہ کہا گیا کہ اذا فسد العالم فسد العالم حقیقت نہ ہو مجاز نہ ہو۔ آب نہ ہو سراب ہو۔ غیر عالم عالم بنجائے۔ اسکے اخلاق فاسد و خراب ہوں تو عالم میں فساد پیدا ہو جائیگا کیونکہ جتنے دوسرے فسادات ہوتے ہیں ان کا تعلق زندگی کے کسی ایک شعبہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ مثلاً معاشرت کے ساتھ سیاست کے ساتھ اخلاق کے ساتھ لیکن مذہب کی وہ طاقت ہے جو دنیا کے تمام شعبوں میں کارفرما ہوتی ہے اسلئے اگر ایک انسان مذہبی فساد میں مبتلا ہو جائے تو نہ صرف اس کی شکل و شمائل بدلے گی

مجمع میں بیٹھکر بڑی تیزیاں دکھلاتا ہے۔ فتنہ وخسا دکی تاریکیوں میں خوب دوڑتا ہی اور صلح و روا داری میں جو برکات ہیں اُن سے اندھا بنا ہوا ہے۔ انسان نما جانوروں یعنی نام نہاد انسانوں نے اُس کا نام عالم رکھ لیا ہی حالانکہ وہ عالم نہیں ہی "۔

بکر فاستکثر من جمع ما قل منه خیر مما کثر " اُٹھا وہ اور جمع کیا اُس نے ایسے معلومات کے ذخیرہ کہ اگر وہ ذخیرہ کم ہوتا تو اس کثرت سے بہتر تھا "
کیونکہ وہ باتیں وہ ہیں جو خلق خدا کے حقیقی علوم و معارف کو مروج کرتی ہیں اور اُن کیلئے عقلی حیثیت سے تباہ کن ہیں۔

حتی اذا ارتوی من اٰجن واکتنز من غیر طائل جلس بین الناس قاضیا ضامنا لتخلیص ما التبس علی غیرہ۔

" یہانتک کہ جب وہ اس مربودار پانی سے سیراب ہو چکا یعنی بخیال خود فارغ التحصیل ہوا اور وہ بیسود خزانہ جمع کر چکا تو بیٹھ گیا لوگوں کے درمیان قاضی بن کر اُن مسئلوں کے حل کی ضمانت کر کے جو دوسروں پر مشتبہ ہو گئے ہیں۔

فان نزلت به احدی المبھمات ھیأ لھا حشوا رثا من رأیه ثم قطع به فھو من لبس الشبھات فی مثل نسج العنکبوت۔

" اگر اُس کے سامنے کوئی مشکل مسئلہ وارد ہو جاتا ہے تو اُسکے لئے سو نچ سانچ کر ایک بھرتی کی فرسودہ رائے اپنی مہیا کرتا ہی پھر اسی کے مطابق یقین کر لیتا ہے یعنی وہ شبہات اور اوہام کو خود ہی اپنے گرد لاتا ہے اور خود پھنس جاتا ہے جیسے

امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ نے اس چیز کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور تصویر کھینچکر دکھلا دیا ہے کہ کبھی کسی سے مرعوب نہ ہونا بلکہ غور کرنا کہ حقیقت کیا ہے فرماتے ہیں:

ان ابغض الخلائق الی اللہ رجلان رجل وکلہ اللہ الی نفسہ فھو جائر عن قصد السبیل مشغوف بکلام بدعۃ ودعاء ضلالۃ فھو فتنۃ لمن افتتن بہ ضال عن ھدی من کان قبلہ مضل لمن اقتدی بہ فی حیوتہ وبعد وفاتہ حمال خطایا غیرہ رھن بخطیئتہ ۔

"تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خدا کے نزدیک مبغوض اور برے دو قسم کے شخص ہیں ایک وہ جس سے خدا نے توفیق کو سلب کر لیا ہے اور اس کے گناہ اتنے بڑھے کر اس کو اسکے حال پر چھوڑ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ راہ راست سے منحرف ہے بدعت کی باتوں اور گمراہی کی دعوت پر جان دئے ہوئے ہے۔ وہ ایک بڑی آزمائش ہے ان لوگوں کے لئے جو اسکے پالے پڑیں۔ وہ بھٹکا ہوا ہے طریقۂ کار سے ان لوگوں کے جو اس کے پہلے تھے اور گمراہ کرنے والا ہے ان لوگوں کا جو اس کی پیروی کریں اس کی زندگی میں اور اسکے مرنے کے بعد وہ دوسرے کے گناہوں کا برداشت کرنے والا ہے اور خود اپنے گناہوں میں گرفتار ہے"۔

ورجل قمش جھلا موضع فی جھال الامۃ عاد فی اغباش الفتنۃ عم بما فی عقد الھدنۃ قد سماہ اشباہ الناس عالما ولیس بہ ۔

دوسرا وہ شخص ہے جس نے جہالت کی باتوں کا ایک ذخیرہ جمع کیا وہ جاہلوں کے

لا يحسب العلم في شيء مما انكره ولا يرى ان من وراء ما بلغ مذهبا لغيره "وہ اتنا تنگ نظر ہے کہ جس شے سے وہ اجنبی ہو اُس کے لئے علم کے وجود کا خیال ہی ذہن میں نہیں لاتا یعنی یہ سوچتا ہی نہیں کہ کوئی دوسرا اس سے واقف ہوگا اور وہ نہیں سمجھتا کہ جہاں تک وہ پہونچا ہے اُسکے آگے بھی دوسرے شخص کے لئے راہ موجود ہے "۔

وان اظلم امر اکتتم به لما يعلم من جهل نفسه ۔

"اگر کوئی مسئلہ اتنا گنجلک ہو کہ اُس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تو وہ سامنے ہی سے غائب ہوجاتا ہے چونکہ جانتا ہے کہ میرا مبلغ علم اس کے حل سے قاصر ہے "۔

تصرخ من جور قضائه الدماء وتعج منه المواريث ۔

ناحق خون اُس کے غلط فیصلوں کے فریادی ہیں اور میراثیں جو غیر مستحق لوگوں کو پہونچ گئی ہیں وہ اُسکے ہاتھوں چیخ رہی ہیں "۔

الى الله اشكو من معشر يعيشون جهالا ويموتون ضلالا ۔ "خدا ہی سے شکوہ کرتا ہوں میں اس جماعت کا جو جہالت کی حالت میں زندگی گذارتی ہے اور گمراہی کے عالم میں دنیا کو خیر باد کہدیتی ہے "۔

ليس فيهم سلعة ابور من الكتاب اذا تلي حق تلاوته ولا سلعة انفق بيعا ولا اغلى ثمنا من الكتاب اذا حرف عن مواضعه ۔

ان کے حلقہ میں قرآن سے بڑھکر کوئی بے قیمت چیز نہیں ہے اُس وقت جب

مکڑی خود ہی اپنے گرد جالا لگاتی ہے اور خود ہی گرفتار ہو جاتی ہے۔"

لا یدری اصاب ام اخطأ فان اصاب خاف ان یکون قد اخطأ وان اخطأ رجا ان یکون قد اصاب ۔

"اُسے نہیں خبر کہ جو میں کہہ رہا ہوں ٹھیک ہے یا غلط اگر ٹھیک بھی ہو تو اُسے اندیشہ لگا ہوا ہے کہ کہیں غلط نہ ہو اور غلط بھی ہو تو اُسے اُمید بندھی ہو کہ شاید صحیح ہی ہو"

جاهل خباط جهالات عاش رکاب عشوات

"وہ جاہل ہے اور جہالت کی تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مارنے والا ہے اندھا ہے اور اندھے پن کی باتوں کا مرتکب ہے"۔

لم یعض علی العلم بضرس قاطع "اُس نے علم کو مضبوطی و استحکام کے ساتھ حاصل نہیں کیا اور نہ اُس میں نقد و تبصرہ اور جانچ پڑتال سے کام لیا"۔

یذری الروایات اذراء الریح الهشیم "جاہلوں کے مجمع میں سوکھا دینے کے لئے حدیثیں تیزی کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے اُس کو اس سے مطلب نہیں کہ اُن احادیث میں کوئی تناسب ہو اور کوئی ترتیب بلکہ وہ روایتوں کو اس طرح پھیلاتا رہتا ہے جس طرح ہوا خشک گھاس کو"۔

لا ملئ والله باصدار ما ورد علیه ولا هو اهل لما فوض الیه "نہ وہ اُن مشکلوں کے حل کرنے کی قدرت رکھتا ہے جو مختلف مسائل میں اُسکے سامنے پیش ہوتی رہتی ہیں اور نہ وہ اہل ہے اس منصب کا جو اُسکے متعلق کیا گیا ہے"۔

اور شرارت کا اظہار ہے اور سوار و پیادہ فوج کی قیادت ہو۔ اس نے اپنے نفس کو تلا ہوا رکھا ہو مفسدہ انگیزی پر اور اپنے دین و ایمان کو بالکل ہلاک کر دیا ہے تھوڑے سے مال دنیا کے لئے جسے موقع پا کر اڑا لے یا کسی فوج کا سردار بن جائے یا منبر پر بلند ہونا نصیب ہو جائے۔ یقیناً کتنی بری تجارت ہے یہ کہ تم دنیا کو اپنے نفس کی قیمت سمجھ لو اور ثواب خداوندی کا عوض قرار دے لو۔"

ومنهم من يطلب الدنيا بعمل الآخرة ولا يطلب الآخرة بعمل الدنيا قد طامن من شخصه وقارب من خطوه وشمر من ثوبه وزخرف من نفسه للامانة واتخذ ستر الله ذريعة الى المعصية ـ

"اور کچھ لوگ وہ ہیں جو دنیا حاصل کرتے ہیں آخرت کے اعمال سے یعنی نماز و روزہ حج و زیارت اور دیگر عبادات میں جو خالص مذہبی کام ہیں۔ دنیا طلبی کو اپنا مقصد قرار دے لیتے ہیں اور یہ نہیں کرتے کہ دنیا کے کاموں میں آخرت کو پیش نگاہ رکھیں انھوں نے اپنی صورت کو سکون و وقار کا مجسمہ بنا لیا ہو اور چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے ہیں اور دامنوں کو گردانے ہوئے ہیں اپنے نفس کو بناوٹ کے ساتھ آراستہ کر کے پیش کرتے ہیں کہ لوگ ان پر اعتبار کرنے لگیں اور ان کی امانتداری کا یقین کر لیں اور وہ ستار العیوب خدا کے ڈالے ہوئے پردہ کو ذریعہ قرار دیتے ہیں اسی کی نافرمانی کا۔"

ومنهم من ابعده عن طلب الملك ضؤولة نفسه وانقطاع سببه فقصرته الحال على حاله فتحلى باسم القناعة وتزين بلباس اهل الزهادة وليس

اسے صحیح طور سے پیش کیا جائے اور اسی قرآن سے بڑھکر مرغوب اور قیمتی کوئی چیز نہیں ہے جبکہ اسکی آیتوں کو بیجا صرف کیا جائے یعنی ان کے مطلب کے موافق اسکی تاویلیں کردی جائیں"۔

ایک دوسرے مقام پر حضرت نے اُن اشخاص کی تفصیل کی ہے جن کے دلوں میں کم و بیش فساد پیدا کرنے کے جذبات موجود ہوتے ہیں لیکن بعض کو مواقع حاصل ہوتے ہیں اور بعض کو نہیں حاصل ہوتے۔ فرماتے ہیں۔

الناس علی اربعة اصناف منهم من لا یمنعه الفساد الا مهانة نفسه وکلالة حدة ونضیض وفره۔

"دنیا میں لوگوں کی چار قسمیں ہیں بعض وہ ہیں جن کو فساد سے کوئی مانع نہیں ہے سوا اسکے کہ ان کا نفس حقیر اور باڑھ کند اور مال کم ہے یعنی نہ عزت و وجاہت ہی حاصل ہے کہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں اور نہ کوئی جوہر ذاتی اور کمال صنفی ہی موجود ہے کہ اس جوہر سے دنیا کو گرویدہ بنائیں اور نہ مال و دولت ہی ہے کہ اس ذریعہ سے لوگوں کو اپنے راستے پر لائیں"۔

ومنهم المصلت لسیفه والمعلن بشره والمجلب بخیله ورجله قد اشرط نفسه واوبق دینه لحطام ینتهزه او مقنب یقوده او منبر یفرعه ولبئس المتجر ان تری الدنیا لنفسك ثمنا ومما لك عند الله عوضا۔

"اور کچھ لوگ وہ ہیں جن کے پاس سامان موجود ہے۔ ہاتھ میں کھنچی ہوئی تلوار ہے

اعمال و مقاصد کا جائزہ لینا جمہور کا فرض ہے یعنی اُسے سمجھنا چاہیئے کہ کون مخلص ہے۔ کس کی آواز پر لبیک کہی جائے اور کس کی پیروی کی جائے۔ دو پکارنے والوں میں کون قابل اتباع ہے اور کون اس قابل نہیں ہے۔

بیشک علمائے مذہب مستحق اتباع ہیں لیکن آپ فقہ کی کتابیں دیکھ لیجئے اُن میں یہ نہیں لکھا ہے کہ جو شخص بھی عالم ہونے کا دعویٰ کرے اُس کی تقلید جائز ہے بلکہ شرائط قرار دئے گئے ہیں جن میں سب سے بڑی چیز عدالت ہے اور اجتہاد۔ ان دونوں کی حقیقی روح اور ان کا اصلی نتیجہ ہے علم اور عمل۔

علمائے مذہب نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی کہ آنکھیں بند کر کے قوت نقد و تبصرہ کو معطل کر کے ہر ایک کی تقلید کر لو۔ بلکہ اس کے لئے شرط قرار دی ہے کہ اطمینان ہو اور اطمینان ایک شئے ہے جو ضمیر سے متعلق ہے۔ پس جس شخص کے علم و عمل کے لحاظ سے آپ کا ضمیر گواہی دے کہ یہ قابل اعتماد ہے اسکی جانب رجوع کیجئے۔

یہ چیز وہ ہے جو ہر شعبۂ زندگی کو حاوی ہے۔ کسی طبیب کے متعلق آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ فن طب سے واقف ضرور ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ ہمارا بدخواہ نہیں ہے اور جان بوجھ کر ہمکو غلط نسخہ استعمال نہیں کرائیگا۔ اسکے بعد کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنے درد کا درمان اُس سے طلب کریں لیکن اگر آپ کو ایک طبیب پر اعتماد نہو تو ہرگز اُس کا علاج نہ کیجئے۔ اب خواہ یہ بے اعتمادی اُسکے مہارت فن اور واقفیت کار کے متعلق ہو اور خواہ اسکی نیک نیتی اور ہمدردی کے متعلق۔

من ذلك فی مراح ولا مغدی ۔

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو دنیا طلب اور جاہ پرست ہیں اور سلطنت و جہانبانی کا انتہائی شوق رکھتے ہیں مگر بے دست و پائی اور بے سرو سامانی اس مقصد میں انکی سدراہ ہے اور اُن کو انکی موجودہ حالت کا پابند بنائے ہوئے ہے اس لئے وہ قناعت کے ساتھ نامزد ہوگئے ہیں اور زاہدوں کے لباس سے آراستہ ہوگئے ہیں یعنی اسکا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ہمکو دنیا کی ضرورت ہی نہیں ورد دنیا ہماری نگاہوں میں حقیر ہے حالانکہ اُن کو قناعت وزہد سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

وبقی رجال غض ابصارھم ذکر المرجع واراق دموعھم خوف المحشر فھم بین شرید ناد وخائف مقموع وساکت مکعوم وداع مخلص وثکلان موجع

"اس کے بعد تھوڑے لوگ رہ جاتے ہیں جنھیں آخرت کی یاد دنیاوی اغراض سے کنارہ کش بنائے ہوئے ہے اور جنھیں وہاں کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا ہے۔ انکو ابنائے زمانہ کے ہاتھوں مصیتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں کسی کو ترک وطن کرنا پڑتا ہے کسی کو جان کا خطرہ لگا رہتا ہے کسی کی زبان بندی ہوتی ہے کوئی خلوص کے ساتھ صحیح راستے کی طرف دعوت دیتا ہے اور کسی کو تکالیف والآم میں زندگی گذارنا پڑتی ہے بیشک یہ مخلص جماعت کم ہوتی ہے۔ اس کی آواز سنی نہیں جاتی۔ اسے شور و شغب کی عادت نہیں ہوتی۔ اسے عوام کی جذب کرنے والی ترکیبیں نہیں آتیں۔ وہ کمتر گوشہ گیر ہوتی ہے اور عزلت پسندی اس کا شعار ہوتی ہے لیکن افراد کا پرکھنا۔ انکے

عوام یہود اس بارے میں بالکل ہمارے عوام کے مثل نہیں ہیں کہ یہ بھی اپنے علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پھر اگر اُنکے لئے اُن علماء کی پیروی درست نہ تھی تو اُنکے لئے بھی ان علماء کی پیروی صحیح نہوگی۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ ایک حیثیت سے تو یہود کے عوام اور ہمارے عوام برابر ہیں لیکن ایک حیثیت سے فرق ہے۔ سائل نے فرق کی وجہ دریافت کی تو حضرتؑ نے فرمایا کہ یہود کے عوام اپنے علماء کی نسبت یہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، مال حرام کھانے اور رشوت لیتے اور احکام خدا کو سفارشوں کی وجہ سے بدلتے ہیں بیجا جانبداریوں سے کام لے کر حقداروں کے حقوق کو تلف کرتے اور غیر مستحق لوگوں کو ناحق دوسروں کے اموال کا مالک بنا دیتے ہیں۔

اگر ہمارے عوام بھی اپنے علماء کے متعلق یہ سمجھ لیں کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہیں جانبداری اور خود غرضی سے کام لیتے ہیں اور دنیا کے اموال پر اس طرح آپس میں لڑتے ہیں جیسے کُتّے ہڈیوں پر اور یہ کہ وہ جس کے خلاف ہوتے ہیں وہ کتنا ہی حقدار کیوں نہ ہو مگر اُس کے حقوق کو ضایع کرتے ہیں اور جس کے طرفدار ہوتے ہیں وہ کتنا ہی تحقیر کا مستحق کیوں نہو مگر اُس کے ساتھ حسن سلوک سے کام لیتے ہیں تو جو شخص ہمارے عوام میں سے ایسے فقہاء کی تقلید کرے وہ اُنہی یہود و نصاریٰ کے مثل ہے جنکی خداوند عالم نے مذمت کی ہے۔ لیکن جو شخص فقہاء میں سے اپنے نفس کی حفاظت کرنیوالا ہو اپنے دین کی نگہداری کرنے والا ہو۔ اپنے خواہش نفس کی مخالفت کرتا ہو اور اپنے خدا کے حکم کا مطیع ہو تو عوام کو درست ہے کہ ایسے شخص کی تقلید کریں

اسی طرح مسائل مذہبی میں ایک شخص کے علم کو سمجھ لیجئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ جہالت و لاعلمی کی وجہ سے ہمکو گمراہی میں مبتلا نہ کریگا اور عمل کو پرکھ لیجئے کہ یہ جان بوجھ کر ہمکو گمراہ نہ کریگا یعنی یہ سمجھنے کے باوجود کہ خلاف شرع ہے ہمکو صرف خود غرضی اور بدنیتی کی بنا پر غلط تعلیم نہ دیگا۔ جب یہ دونوں باتیں پورے طریقہ پر پایۂ ثبوت کو پہونچ جائیں تو اب کوئی وجہ نہیں کہ آپ بات بات میں اُسکی گرفت کیجئے اُسکو اعتراضات کا آماجگاہ بنائیے اور نکتہ چینیوں کا مرکز قرار دیجئے۔

بیشک شروع میں بڑی چھان بین کیجئے۔ سمجھ لیجئے کہ کون ہمارے لئے مصلح ہے اور کون مفسد۔ اندھی تقلید نہ کیجئے یعنی کسی انسان کو بے سمجھے بوجھے کہ اس کے خصوصیات کیا ہیں وہ ہمارے لئے مفید ہے یا مضر اپنا پیشوا نہ بنا لیجئے۔

ہوا کے رخ پر اُڑنا، سیلاب کے بہاؤ میں بہہ جانا یہ اندھی تقلید ہے۔ اس کو اسلام نے رد کیا ہے۔ تقلید کرو تو یہ سمجھ کر کہ جس پر ہم اپنے عمل کی ذمہ داری عائد کر رہے ہیں یہ درحقیقت اس قابل ہے کہ ان ذمہ داریوں کو پورا کر سکے۔

طبرسی کی روایت میں ہے اس آیت کی تفسیر میں کہ ومنھم امیون لایعلمون الکتاب الا امانی وان ھم الا یظنون جس میں یہودیوں کی مذمت کی گئی ہے بایں بنا کہ وہ بے سمجھے بوجھے دوسروں کے کہنے پر چلتے ہیں کسی نے امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا کہ جب یہود و نصاریٰ کو ناواقفیت کی وجہ سے اپنی کتاب کے علم کا ذریعہ ہی صرف یہ ہے کہ وہ اپنے علماء سے دریافت کریں تو پھر خدا نے اُنکی مذمت کس لئے کی ہے؟ کیا

اخلاق و مذہب سے گرے ہوئے ہیں تو بھی اُن کا ضمیر اُن امور کے ناگوار ہونے کا احساس کرتا رہیگا۔ اور اس لئے ادھر سلطنت کی مٹھی ڈھیلی ہوئی اور ادھر اُن کے اصلی حسیات و معتقدات پوری قوت کے ساتھ سیلابی شکل سے ابل پڑے اور حالات میں انقلاب ہو گیا یعنی وہ فساد صلاح سے بدل گیا۔

مجھے موقع نہیں ہے کہ میں تشریح کے ساتھ کسی چیز کو اب بیان کر سکوں مگر میں حوالہ دیتا ہوں کہ سلطنت عباسیہ کے متشدد سلاطین کے سوڈیڑھ سو برس کے طولانی دور میں سلطنت کے انتہائی جبروت و سطوت کے باوجود مذہب جعفری دنیا میں کیونکر باقی رہ گیا؟ ملاحظہ کیجئے دس بیس چالیس برس کی مدت نہیں صدیوں کا زمانہ اس میں سلطنت کی پوری طاقت ایک مسلک کے فنا کرنے میں صرف ہو لیکن پھر بھی وہ مذہب دنیا میں باقی رہے۔ اُسکے تعلیمات مدون ہوں اور اسکے احکام و مسائل محفوظ رہیں۔ یہ صرف اُن علمائے مذہب کی اُن مدبرانہ اصلاحوں کا نتیجہ تھا جو بغیر دنیا میں فتنہ پردازی کئے ہوئے بغیر فساد برپا کئے ہوئے، بغیر بغاوت کئے ہوئے، بغیر انقلاب پیدا کئے ہوئے، بغیر تخت سلطنت کو الٹے ہوئے، صرف خاموشی کیساتھ اصلاح میں مصروف تھے یعنی یہ تاریخ میں مصلحانہ حیثیت کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ سلطنت کے مقابلہ میں علماء کی اصلاحی جدوجہد کی کامیابی کا بہترین نمونہ ہے۔

ہاں بے شک شرط یہی ہے کہ علماء مخلص علماء ہوں اور اگر علماء خود ہوا کے رخ پر

اور ایسے لوگ فقہائے شیعہ میں سے بعض افراد ہوتے ہیں۔ سب نہیں ہوتے "۔

یاد رکھئے یہ مذہب وہ نہیں ہے جس نے آنکھوں پر پردہ ڈالا ہو جس نے قوت غور وفکر کو سلب کیا ہو جس نے دماغ اور ذہن کو معطل کیا ہو بلکہ اس نے قیود بیان کئے ہیں شرائط عائد کئے ہیں نقد وتبصرہ کا احساس پیدا کیا ہے۔ اہل نظر کو دعوت دی ہے کہ وہ سمجھ کر دیکھ کر کہ کون مصلح بن سکتا ہے اور کون مفسد کسی شخص کی پیروی پر آمادہ ہوں اور اسکی آواز پر لبیک کہیں۔

جو حقیقی علمائے مذہب تھے وہ ہمیشہ اصلاح عالم کے ذمہ دار رہے در حقیقت وہ دوسری چیز جو فساد کی باعث ہے یعنی سلطنت کی طاقت، اس سے جو فساد دنیا میں پیدا ہوتا ہے اُس کا مقابلہ اگر ہوتا ہے تو علماء مذہب کی اصلاحی طاقت سے جبکہ وہ مذہب کی صحیح خدمت انجام دیتے ہیں۔

باوجودیکہ بہت ممکن ہے علما کسی وقت میں بے دست و پا ہوں اور مادی طاقتوں سے وہ حکومت کا مقابلہ نہ کرسکتے ہوں لیکن اگر وہ خود فساد کے راستے پر نہیں جا رہے ہیں اور عالم کی بہی خواہی اور مذہبی روح کی صحیح زندگی اُن میں موجود ہے تو وہ اُن تمام خرابیوں کے باوجود جو سلطنت کی فولادی گرفت سے معاشرتی حیثیت سے پیدا ہو رہی ہیں اپنی خاموش ہدایتوں کے ساتھ قوم کی ذہنی و عقلی صلاحیتوں کی حفاظت کرتے رہینگے جس کی بنا پر اگر وہ بجبر و ظلم موجودہ حالت میں سلطنت کے اجرا کردہ قوانین کے ماتحت کچھ ایسے امور کو اختیار بھی کریں جو معیار

شریعت بھی تھا یہ حکم وہاں بھی پہونچا۔ اس موقع پر قبلہ و کعبہ سلطان العلما رسید محمد صاحب رضوانمآب نے یہ یادگار خط تحریر فرمایا۔ ذرا الفاظ دیکھئے گا سلطنت کے مقابلہ میں ایک مصلح مذہب کس طرح سے اپنے فرائض کو انجام دیتا ہے۔

"احکام شاہی بہ ارتکاب رقص و مناہی در محکمہ جات رسید الحال حسب حکم واجب الانقیاد جناب قدس آلہی بہ اجتناب از رقص و غنا و ملاہی بار گاہ شاہی از جانب ما ہمی بنا بر دولت خواہی برسانید و دستخط فقیر را بملاحظہ معلی بگذرانید و در دوام حق اندیشہ نمائید و ما علی الرسول الا البلاغ و السلام علیکم ورحمۃ اللہ"

اس طرح سے حکام اور سلاطین سے مرعوب نہیں رہے بلکہ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ انھوں نے یہ احساس کیا کہ درحقیقت یہ وہ فرائض ہیں جن کے ذریعہ سے اصلاح ملک و ملت ہوتی ہے۔

یہ غلط ہے کہ نظام سلطنت کے لئے علما مضر ثابت ہوے۔ تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ایران میں شاہ سلطان حسین صفوی کے سلطنت کی رونق جو علامہ مجلسی کے عہد میں تھی وہ انکی وفات کے بعد باقی نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان کے عدم تدبر نے خود سلطنت ہی کی بنیادوں کو منہدم کر دیا۔

وہ چیزیں جن تک سلاطین کا دماغ نہیں پہونچتا تھا وہ صرف مصلحین مذہب تھے جن کا دماغ ان نکات تک پہونچ جاتا تھا اور انھوں نے وہ اصلاح کی جس سے سلطنت کو فائدہ حاصل ہوا اور دنیا نے اس کی گواہی دی کہ تدبر کا اقتضا یہی تھا۔

اثر نہ لینے والے، خود سلطنت کی طاقت سے مرعوب ہو جانے والے، خود سلاطین و ملوک کے دروازوں پر سجدے کرنے والے ہوں تو وہ سلطنت کے مفسدانہ تدابیر کا مقابلہ کیا کریں گے خود ہی جس راست پر سلطنت جائیگی اس راستہ پر چلے جائینگے۔

حقیقی علماء جو تھے وہ کبھی سلطنت سے مرعوب نہیں ہوئے انھوں نے مفاد عامہ کا ہمیشہ خیال رکھا یعنی سلطنت سے بزور قوت تصادم مفاد عامہ کے خلاف سمجھا مگر احکام مذہبی کی تلقین کو بھی ہمیشہ اپنا فریضہ خیال کیا۔

خود ہمارے صوبۂ اودھ کی تاریخ میں ایسے واقعات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ علماء نے کس طرح اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں سلطنت کی طاقت کا اثر نہیں لیا۔ اب تشریح کا وقت نہیں ہے اور بہرحال مجھے بیان ختم کرنا ہے جناب غفرانمآب کا بھنگ کے متعلق موعظہ کا واقعہ۔ مجھے تفصیل سے اسے بیان نہیں کرنا ہے مشہور ہے۔ یہ کہہ دیا گیا تھا کہ مجلس وعظ میں بادشاہ آگئے ہیں اس لئے آج بھنگ کے متعلق کچھ بیان نہ ہو۔ فرمایا آج ہی تو اسکا موقع ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مصلحانہ آواز تھی اس لئے اس کا اثر بھی ہوا۔ لیکن میں جو چیز پیش کرنا چاہتا ہوں حقیقۃً تاریخ اودھ میں یادگار حیثیت رکھتی ہے۔

مولوی عبدالغنی کی تاریخ اودھ جلد ۵ میں۔ یہ واقعہ مذکور ہے کہ کسی شاہی محل کے یہاں لڑکا پیدا ہوا اور بادشاہ نے خوشی میں حکم دیا کہ سرکاری دفتروں میں محفل رقص و سرود قائم کی جائے۔ چونکہ دفاتر حکومت میں محکمہ مرافعہ و

گو بجتی تھی کوئی جواب دینے والا نہ تھا لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ اسی پرامن خاموش صدا نے ایک وقت میں دنیا کو اپنی صدائے بازگشت سے معمور کر دیا۔ تلواروں کی جھنکار باقی نہیں ہیں لیکن وہ لاالہٰ الا اللہ کی آواز دنیا کے ہر ہر گوشہ میں ہر مسلمان کے کان میں پانچ وقت اس اعلان کے ساتھ آتی ہی جس سے شان توحید کا مظاہرہ ہوتا ہی۔ اسلام کو قائم کرنے والی وہی چیز تھی جس کا اثر پائدار رہ گیا لیکن یہ مسلمانوں کی غلط فہمی ہے کہ وہ اسلام کی روح جنگ و جدل ہی کو سمجھ لئے ہیں اس لئے ہر موقع بے موقع بھڑ کر جان دیدینے والے کو "شہید" اور جان لینے والے کو "غازی" کا خطاب دیتے ہیں۔ یہ ہرگز اسلام کی تعلیم نہیں ہے۔

حالات حاضرہ

یا

دنیا کے موجودہ فسادات

دنیا میں ہمیشہ صلاح اور فساد کی طاقتیں برسر پیکار رہی ہیں اور مختلف طرح کے فسادات پیدا ہوتے رہے لیکن ماضی اب گذر چکا ہمارا اُسکے ساتھ اب براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ دیکھنے کی یہ ضرورت ہے کہ اسوقت

ملاحظہ کیجئے یہ رمز کہ حکومت برطانیہ کی سلطنت تجارت سے شروع ہوتی ہے ہندوستان والے
آج سمجھے یعنی جب وہ پہلا قدم اٹھا تھا۔ تو ہندوستان میں کوئی نہیں سمجھا تھا اب
جبکہ نتیجہ سامنے آگیا تب سمجھے کہ کیونکر تجارت سے سلطنت قائم ہوتی ہے۔ ایران میں
ناصرالدین شاہ نے بھی اس کو نہیں سمجھا تھا جبکہ انھوں نے تمباکو کا معاہدہ سلطنت
برطانیہ کے ساتھ کیا لیکن سرکار میرزائے شیرازی وہ تھے جنھوں نے یہ اندازہ
کرلیا کہ یہ معاہدہ تمباکو کا نہیں ہے بلکہ ملک ایران کا بیعنامہ ہے چنانچہ وہ سرکار
میرزا ہی تھے جنھوں نے ایسے پر جبروت بادشاہ کے مقابلہ میں یہ فرمان نافذ
کردیا تھا کہ تمباکو پینا حرام ہے۔

اس حکم کا وہ اثر تھا کہ ایران میں انقلاب ہوگیا دوکانیں بند ہوگئیں قلیاں
توڑ ڈالے گئے تمباکو بکلم متروک ہوئی جس کا اثر تھا کہ ناصرالدین شاہ نے مجبور ہوکر
ٹھیکہ منسوخ کیا وہ الفاظ تھے جنکا یہ نتیجہ تھا ورنہ آج ایران اسی طرح غلام ہوتا
جس طرح ہندوستان غلام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علمائے مذہب اگر حقیقی معنوں میں عالم مذہب ہیں تو وہ عالم کی
ایسی اصلاح کرسکتے ہیں کہ دنیا میں کوئی مصلح ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہرگز عالم
وہ نہیں ہے جو دنیا میں فساد پیدا کرے۔ ہنگامہ برپا کرے اسلام یہ تعلیم دینے کے لئے
نہیں آیا ہے کہ خواہ مخواہ جنگ وجدل برپا کردیا وہ خاموشی کے ساتھ اصلاحی جدوجہد
کا حامی ہے۔ قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا کی وہ ایک آواز تھی جو خاموش فضا میں

دیا جاتا ہے کہ مذہب فساد کا ذریعہ ہے، اسلئے مذہب مٹا دینے کے قابل ہے
دنیا امن واماں اور سکون واطمینان کی محتاج ہے اور مذہب اس سکون و اطمینان
کا دشمن ہے۔ مذہب جھگڑے کراتا ہے۔ مذہب فساد برپا کراتا ہے اس لئے
مذہب کو مٹا دینا چاہیئے اور اسی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علمائے مذہب کے اقتدار کو
بھی فنا ہونا چاہیئے کیونکہ اس جماعت کے ذریعہ سے ہمیشہ تخریب ہی ہوتی رہی
اور یہ طبقہ دنیا کو ہمیشہ فساد کی طرف لیجاتا رہا۔ درحقیقت یہ دونوں چیزیں
دست وگریبان کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی اگر مذہب فساد کا ذریعہ ہے تو
بے شک علمائے مذہب کا اقتدار بھی فنا کئے جانے کے قابل مگر میں نے گزشتہ
بیانات میں اسکو واضح کیا ہے کہ مذہب فساد کا ذریعہ کس لئے قرار پایا۔ میں نے
دکھلایا کہ چونکہ مذہب اصلاح کا بہترین ذریعہ ہے، اسی لئے اس کو فساد کا ذریعہ
قرار دیا گیا۔ اس کے لئے میں نے مثالیں دیں کہ جتنی بیش قیمت چیز ہوگی اسی کی
نقل زیادہ اتاری جائیگی اور ملمع زیادہ پر فریب کیا جائیگا۔

مذہب کے ذریعہ فساد قرار دئے جانیکا رمز بھی اسکی وہ اصلاحی طاقت ہے جو
اسکی اصل حقیقت میں مضمر ہے۔ مذہب کا لباس مختلف تحریکوں کو اسی لئے پہنایا
جاتا ہے کہ ہر انسان کے دماغ میں مذہب کا نام سنکر ہی یہ بات آجاتی ہے کہ اس میں
کوئی فتنہ پردازی شریک نہیں ہے۔ بس اسی لئے غلط تحریکوں کو مذہب کا لباس
پہنایا جاتا ہے کہ یہ انقلاب ذہنیت کا کامیاب ذریعہ ہے۔

دنیا میں کیا فسادات موجود ہیں اور اس وقت جو فساد ہیں اُن میں ہمکو کیسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

لامذہبیت موجودہ زمانہ میں جو سب سے بڑا فساد مفادِ عامہ کے لئے نہایت خطرناک ہے وہ لامذہبیت کا سیلاب ہے۔ میں نے "تعمیرِ انسانیت" کے موضوع میں کافی تفصیل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ مذہب کس طرح سے دنیا کی اصلاح کا ذمہ دار ہے۔ اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ لامذہبیت ایک فسادِ عظیم کی حیثیت رکھتی ہے جو کسی ایک شعبۂ زندگی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ عقلی۔ معاشرتی۔ تمدنی۔ اقتصادی۔ اخلاقی ہر قسم کے فساد کا سرچشمہ ہے یعنی دنیا میں ایک عظیم انقلاب ہو رہا ہے دماغوں میں، ذہنیتوں میں۔ معاشرت میں۔ اخلاق وعادات میں ہر طرف تبدیلیاں ہو رہی ہیں صرف اس لئے کہ مذہب کی جگہ لامذہبیت نے لے لی ہے۔

یہ لامذہبیت اپنی بے اصولیوں کے ساتھ اس وقت ترقی کر رہی ہے اس کے اسباب کیا ہیں اور کیا دلائل ہیں جو مذہب کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں اور لامذہبیت و مذہب کا تصادم کن وجوہ پر مبنی ہے اور انکا حل کیا ہے؟ یہ خود ایک مستقل موضوع ہے جو جداگانہ حیثیت سے محلِ بحث قرار پانے کا مستحق ہے لیکن اس وقت مجھے صرف اُس شعبہ سے مطلب ہے جو میرے موضوعِ کلام میں داخل ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں ایک سبب لامذہبیت کے اختیار کرنے کا یہ قرار

مذہب فنا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ مذہب ہی سے دنیا میں تمدن کی اصلاح ہوتی ہے۔ بے شک یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حقیقی مذہب کے حقیقی تعلیمات جو واقعی اصلاح تمدن کے ذمہ دار ہیں۔ وہ کیا ہیں۔ اس میں تھوڑی سی قوت غور و فکر صرف کرنے کی ضرورت ہوگی۔

مگر میں اس کو ایک دماغی کاہلی سمجھتا ہوں کہ انسان ایک چوراہے پر پہونچ کے اس خیال سے کہ معلوم نہیں کون راستہ اس میں ٹھیک ہے۔ اس چوراہے سے ہٹ جائے نتیجہ یہ ہوگا کہ منزل سے جتنا قریب ہوا تھا اب اتنا ہی پھر دور ہو جائیگا اُسکو لازم ہے کہ وہ دریافت کرے اور پوچھے کہ ان میں سے کون راستہ منزل مقصد تک گیا ہوا ہے۔

اسی طرح مذاہب کا اختلاف دنیا میں اگرچہ دماغ کو پریشانی اور اضطراب میں ضرور مبتلا کرے گا کہ انسان آخر کیا کرے اور کدھر جائے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اصل اس نقطۂ مشترک ہی سے ہٹ جائے جہاں سے مختلف مذاہب کی شاخیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کہنا کہ کیا معلوم کون مذہب حق ہے اور کون باطل کون مذہب اصلاح کا ذمہ دار ہے اور کون نہیں لہذا ہم مذہب ہی بار آئے یہ بات دماغی کاہلی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر انسان کی ترقی اس میں ہے کہ وہ دماغی قوتوں کو مقام عمل میں لا کر صرف کرے تو درحقیقت یہ اُسکی دماغی ترقی نہیں سمجھی جا سکتی کہ وہ اختلاف مذاہب کے

اس لئے اصل مذہب کو مٹا دینا ایک طرف اگر ان فسادی کارروائیوں کے سدباب کا باعث ہے تو دوسری طرف اس حقیقی مذہب کے اصلاحی مفاد کو بھی محو کرنا ہے جو در حقیقت اصلاح کا مؤثر ترین سبب ہے۔

جھوٹ کو جبتک سچ کا لباس پہنا یا جائے وہ جھوٹ نہیں ہے تو کیا سچ مٹا دینے کے قابل ہے اسلئے کہ جھوٹ کو سچ کا لباس پہنا یا جاتا ہے؟ سونا دنیا سے فنا کر دینے کے قابل ہے اسلئے کہ پیتل سونیکا ملمع اپنے اوپر چڑھا کر سونا بنجاتا ہے؟ پانی دنیا سے محو کر دینے کا مستحق ہے اسلئے کہ سراب آب کی شکل بن کر پیاسوں کو دھوکا دیتا ہے؟ حقیقت فنا کر دینے کے قابل ہے اسلئے کہ مجاز حقیقت کا بھیس بدل کر سامنے آتا ہے؟ اس طرح تو دنیا میں ہر قیمتی چیز فنا کر دینے کے قابل ہوگی اس لئے کہ اسکی غلط نقل دنیا کو دھوکا دیتی ہے۔

سچ بہر حال سچ ہے۔ سونا بہر صورت قیمتی شے ہے۔ پانی ضرور سرچشمۂ زندگی ہے اور ہر حقیقی شے جو دنیا کے لئے مفید ہو وہ بہر حال مفید ہے لیکن ضرورت اسبات کی ہے کہ انسان آنکھیں کھول کر نقل اور اصل میں تمیز کرے۔ وہ سمجھے کہ کون حقیقت ہے اور کون مجاز۔ کون حق ہے اور کون باطل۔ کون سچ ہے اور کون جھوٹ۔ نہ یہ کہ جھوٹ کے اندیشہ میں سچ کو فنا ہی کر دیا جائے۔

مذہب کا نام دنیا میں فساد کا ذریعہ قرار پایا۔ اسکے تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عذر نہیں ہے میں تو خود اس کا طویل شکوہ اس کے پہلے کر چکا لیکن اسکی وجہ سے

اصلاح کی حقیقی جدوجہد یہ ہوئی کہ آپ مذہب کے تعلیمات کی ترویج کریں اور اسکی کوشش کریں کہ دنیا ان کی سالک بنجائے۔

لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ مذہب دنیا میں فساد اور بربادی کا پیش خیمہ ہے اس لئے مٹا دینے کے قابل ہو۔

باہمی اختلافات کا فساد

جو کچھ میں نے اسکے پہلے کہا وہ اصل تعلیمات اسلام سے تعلق رکھتا ہے مگر میرے الفاظ کی روانی کم ہوجاتی ہے میری زبان میں وہ طاقت باقی نہیں رہتی جب میں مسلمانوں کے طرز عمل پر نگاہ ڈالتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ مذہب جو دنیا میں امن وامان کے تعلیمات کا علمبردار تھا۔ جو دنیا سے اختلافات کو مٹا دینے کے لئے آیا تھا اس مذہب کو ذریعۂ فساد قرار دیا گیا۔ اور اسکے ماننے والے ایک دوسرے کا گلا گھوٹنے کے اوپر طیار اور طرح طرح کی ایذا رسانی کے اوپر آمادہ ہیں۔

سب سے بڑی چیز جس کا پیغمبر اسلام نے سد باب چاہا تھا وہ یہی تھی کہ مسلمان ایک دوسرے کو کافر نہ کہیں صحیح بخاری میں تو یہاں تک ہے کہ من کفر مسلما فقد باء بہ احدھما۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص کسی سچے مسلمان کو کافر بنائے وہ خود کافر ہے۔

آماجگاہ میں اپنی قوت امتیاز کو صرف کئے بغیر سپر انداختہ ہو جائے بلکہ اس کو تحقیق کرنا چاہیے کہ حقیقی مذہب کے تعلیمات کیا ہیں۔

دنیا میں اسلام اس بات کا علمبردار ہو کر آیا تھا کہ وہ امن و امان قائم کرے اور اس نے اپنا جوہر خصوصی قرار دیا۔ کنتم اعداآء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔

"تم لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اس نے تمھارے دلوں میں میل جول پیدا کیا جس کی برکت سے تم بھائی بھائی ہو گئے"۔

انما المؤمنون اخوۃ "سب خدا کو ماننے والے آپس میں بھائی بھائی ہیں"

اس نے ظاہر کر دیا کہ یہ دنیا میں عالم انسانیت کے اندر جو پھوٹ ڈالدی گئی ہے یہ تمام تفریقیں محو ہو جانے کے قابل ہیں۔ قریشی اور غیر قریشی کا امتیاز نہو۔ کالے اور گورے میں فرق نہو بلکہ سب مساوات رکھیں گویا ایک عظیم برادری دنیا میں قائم کر دی جس میں ہمدردی ہو جس میں مواسات ہو جس میں ایثار ہو۔

اگر کوئی مذہب ایسا ہے جو اپنے تعلیمات کے اعتبار سے دنیا میں امن و امان کا حامی ہو، صلح و آشتی کی فضا پیدا کرنے کا علمبردار ہو تو یقیناً وہ مذہب اصلاح عالم کے لئے باقی رکھے جانے کے قابل ہے۔ یہ اور بات ہے آپ کہئے کہ اس کے ماننے والے درحقیقت اس پر عامل نہیں ہیں، اسکے معنی یہ ہونگے کہ مسلمان اعتبار میں درحقیقت مسلمان نہیں ہیں۔

دو بھائی ذاتی امور میں ایک دوسرے کے ساتھ متحد الرائے نہیں ہوتے۔ افراد انسانی بہت سی باتوں میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں امور معاشرت میں۔ امور تمدن میں اور ہر شعبۂ زندگی میں لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ یہ اختلاف عداوت کی شکل اختیار کرے اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنجائے۔

کیوں نہ ہم مشترک امور پر مجتمع ہوں۔ اُن نقطوں پر جو ہم میں اختلافی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہمارا رسول ایک ہمارا خدا ایک، ہماری کتاب ایک، ہمارا قبلہ ایک، نماز بہرحال دونوں کے نزدیک واجب، روزہ دونوں کے نزدیک فرض اسلام کے اندر ان چیزوں میں اختلاف نہیں ہے۔ اہلبیت رسول تمام مسلمانوں کے نزدیک قابل عزت ہیں کون مسلمان ہے کہ اُسکے مذہب میں اہلبیت رسول قابل عزت نہوں پھر کیوں نہ ہم انہی مشترک نقطوں پر اگر ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہوجائیں کیوں نہ ہم میں اتنی رواداری پیدا ہو اور ہمارے دل میں اتنی وسعت ہو کہ ہم اختلافات کو برداشت کرسکیں یعنی یہ سمجھنے کے باوجود کہ خیال میں اختلاف ہے ہم اُن اختلافات کا لحاظ نہ کریں، اتحاد عمل سے کام لیں۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آپس میں دست و گریباں ہوتے ہیں۔ یہ طریقہ درحقیقت خود مسلمانوں کیلئے مضر ہے۔ قرآن مجید نے بتلا دیا تھا کہ لاتنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم "آپس میں جھگڑے نہ کرنا، نہیں تو تم کمزور ہوجاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائیگی"۔
مگر ہم نے اس تعلیم کو بھلا دیا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسوقت ہندوستان جس دور سے

رسالتمآبؐ کی حیات میں ایسی جماعتیں موجود تھیں جن کے متعلق قرآن نے کہا کہ ان کے دلوں میں حقیقی اسلام کی روشنی نہیں ہے لیکن رسالتمآبؐ نے یہ کبھی نہیں کیا کہ منافقوں کے دلوں سے پردہ ہٹائیں۔ باوجودیکہ آپ کو خدا کی طرف سے بتادیا گیا تھا، باوجودیکہ آپ کو تعلیم دیدی گئی تھی لیکن چونکہ ان لوگوں کے افشائے راز سے مسلمانوں کی ظاہری یکجہتی و یک رنگی کو صدمہ پہونچتا۔ اس بنا پر آپ نے ان لوگوں کی پردہ دری نہیں کی بلکہ پردہ داری سے کام لیا۔

اگر آپ سے کسی شخص کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ سچا مسلمان نہیں ہے اور حقیقی اعتقاد نہیں رکھتا۔ اسکا نماز روزہ وغیرہ سب ظاہری ہے۔ اس میں روح نہیں ہے تو آپ فرماتے تھے کہ ایسے ظاہری نماز روزہ بجالانے ہی والوں کے ساتھ مجھے حکم ہے کہ میں اسلامی برتاؤ کردں اور انکے قتل سے مجھے مانعت ہے۔

اسامہ بن زید نے لڑائی میں ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے تلوار کے سامنے آتے ہی لاالٰہ الا اللہ کہدیا تھا حضرتؐ نے سخت عتاب فرمایا۔ اسامہ نے کہا اس نے تلوار کے خوف سے کلمہ جاری کیا تھا تو فرمایا کہ کیا تم نے اس کے دل کو شگافتہ کرکے دیکھ لیا تھا۔

یہ پیغمبر اسلام کی تعلیم تھی جس کو ہم نے پس پشت ڈالدیا۔ ہمارا دلچسپ مشغلہ ہے کہ اپنے مخالف فریق کو کفر کے فتوے سے سرفراز کریں بصرف اس بنا پر کہ وہ ہمارے ساتھ اتفاق مسلک نہیں رکھتا حالانکہ اختلاف طبائع انسانی میں ناگزیر ہے

مانا کہ کہنے والے نے سچائی اور نیک نیتی سے نہیں کہا لیکن ہمکو تو مقولہ کو دیکھنا چاہیئے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ان الفاظ میں سچائی ہوئی تو میرا ضمیر خود میرے اوپر ملامت کریگا۔ ہم کو خود شرم آنیکا موقع ہے۔ ہمارے اخلاق، اور ہمارے اوصاف اتنے طشت از بام ہوگئے کہ اب وہ غیروں کی طرف سے ہمارے مونھ پر لائے جاتے ہیں اور ہم کوئی جواب نہیں دیسکتے یقیناً اگر ہم اپنے تئیں مسلمان کہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے تئیں "امت مرحومہ" کا مصداق بتاتے ہیں اگر ہم اپنے تئیں نجات کا مستحق سمجھتے ہیں تو ہم کو اپنے افعال، اعمال سے یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ ہم امت مرحومہ کہے جانیکے مستحق ہیں اسلئے کہ ہم اُس پیغمبر اسلام کی تعلیم پر عمل کرنیوالے ہیں جو رحمتہ للعالمین بنکر آیا تھا۔

تعجب کی بات ہے کہ عیسائی جنکی توریت اور انجیل میں یہ موجود ہو کہ ہم اصلاح اور سلامتی کے لئے نہیں آئے ہیں بلکہ تفریق ڈالنے آئے ہیں ہم اس لئے آئے ہیں کہ باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کردیں عیسائیوں کی انجیل متی میں یہ الفاظ موجود ہیں جس مذہب والوں کی کتاب میں یہ تعلیم موجود ہو وہ دنیا میں یکجہتی اور اتفاق کا نمونہ پیش کر رہے ہوں لیکن مسلمان جن کی کتاب میں یہ ہو کہ ہم اتفاد پیدا کرنے آئے ہیں وہ دنیا میں فراق کا نمونہ پیش کریں۔ باہمی تصادم۔ جنگ و جدل۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے۔ ایک دوسرے کو فنا کرنے کے لئے تیار۔ اسوقت جبکہ آئین جدید کی تشکیل ہو رہی ہے جبکہ ہندوستان ایک نئے دور زندگی میں داخل ہو رہا ہے جبکہ ہر ایک بیدار اقتدار کے اضافہ کی طرف متوجہ ہے ٹھیک اسوقت ہم اپنے درمیان پرانے جھگڑوں کو زندہ کرنے میں مصروف ہیں۔

گذر رہا ہے مسلمانوں کو جتنے عظیم مشکلات کا سامنا ہے، ان عظیم مشکلات میں ہمارا طرز عمل اگر یہ رہا۔ اگر ہم آپس میں لڑتے رہے، اگر یونہی ہم میں تصادم ہوتے رہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا وجود صفحات ہندوستان سے اسی طرح محو ہو جائیگا جس طرح اسپین سے ہمارا وجود فنا کر دیا گیا جس طرح فلسطین سے مسلمانوں کے نکالنے کی کوشش کیجا رہی ہے ہمارے وجود کو فنا کر دیا جائے اسکی کوشش تمام دنیا میں جاری ہے۔

ہندوستان میں کہ جو مختلف طاقتوں کا آماجگاہ ہے اور مرکز ہے مختلف قوتوں کے باہمی تصادم کا اگر ہم نے اپنی قوت اجتماعی کو منظم نہ کیا۔ اپنے عناصر کو مجتمع نہ رکھا تو ہرگز ہمارا وجود اس صفحہ پر باقی نہیں رہ سکتا اور ہرگز ہم اس سرزمین پر زندہ رہنے کے قابل نہیں ہیں۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ کونسل میں آریوں کے قانون عقد نکاح کے بارے میں جب یہ سوال پیش کیا جائے کہ ہندو مذہب کوئی ایک مذہب نہیں ہے تو ہندو ممبروں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ اسلام کب ایک متحد مفہوم رکھتا ہے اگر اسلام کوئی ایک متحد مفہوم رکھتا ہوتا تو کس لئے مسلمان ایک دوسرے کو کافر کہتے اور ڈاکٹر امبیدکار کو جس وقت اسلام کی دعوت دیجائے تو وہ یہ کہکر اسلام کے راستے سے ہٹ جائیں کہ اسلام میں بہت سی جماعتیں ہیں میں آخر کس جماعت کا ساتھ دوں یا اور گاندھی کے بیٹے جس وقت اسلام قبول کر کے دوبارہ اپنے دیرینہ مذہب پلٹنا چاہیں تو یہ بیان دیں کہ میں نے مسلمانوں میں کوئی اخلاقی بلندی ایسی نہیں پائی جو دوسرے مذہب والوں میں نہ ہو۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اسوقت جو بھی کہے کہ مذہب کے واسطے لڑو وہ مصلح نہیں ہے مفسد ہے۔ مصلح وہ ہے کہ جو اس وقت ایک متحد راستے پر لائے اور یہ کہے کہ آپس کے اختلافات مٹاؤ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی ایک فریق اپنا مسلک ترک کر دے۔ جو نظری اختلافات صدیوں سے نہیں مٹے وہ ایک وقت میں کیسے مٹ سکتے ہیں لہذا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر ایک اپنی رائے کو بدل دے۔ ہر ایک اپنے مذہب کو چھوڑ دے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسوقت ان اختلافات کو زیادہ اچھالیں نہیں بلکہ متحدہ مقاصد و اغراض میں متحد حیثیت سے کوشش کی طرف متوجہ ہوں۔ آپس میں جنگ نہ کریں۔ تصادم کی صورتیں نہ پیدا کریں۔

مجھے تو افسوس ہے اور مسلمانوں کے لئے ننگ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے داخلی مسائل میں غیر مسلم جماعتوں کی جانب سے حکم مقرر کئے جائیں۔ یہ درحقیقت اسلام کیلئے ننگ و عار کا باعث ہے۔ مسلمانوں کے لئے نہایت شرم کا مقام ہے کہ انکے قوائے اصلاحی اتنے معطل ہو گئے ہیں۔ ان میں صلاح و رواداری کی طاقتیں اتنی فنا ہو گئی ہیں اور اسلامی یکجہتی کی روح اتنی مضمحل ہو گئی ہے کہ وہ آپس میں خود کسی نقطہ پر نہیں پہونچ سکتے۔ غیر مسلم جماعتوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ انکے درمیان جو فسادات پیدا ہوں انکا تدارک کریں یعنی مسلمانوں کے مصلح غیر مسلم قرار پائیں۔

یہ انتہائی قابل عبرت صورت ہے۔ اگر ان حالات میں تبدیلی نہ ہوئی بلکہ یہ حالات ترقی پذیر رہے یا اسی صورت پر قائم رہے تو اسلام کا خدا حافظ اور مسلمانوں کو خود اپنی ہستی کے اوپر پہلے ہی سے فاتحہ پڑھ لینے کی ضرورت ہے۔

(تمت)